

جاسوسی دنیا نمبر 83

حکیلہ غبار

پڑھنے والے کام

(مکمل ناول)

”ہاں! بھی تو یہیں ہیں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کسی دن جیل میں ہوں گے اور کچھ حضرات، پستان میں۔“

”غلط سمجھے۔“ آصف مضجکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ ”سوال یہ ہے کہ ایسے اہم کیس میں جائے واردات پر سعید اور حامد کیوں بھیجے گے ہیں۔“

”کس اہم کیس میں...!“

”ملک کا مشہور ریاضی دان ڈاکٹر داؤڈ قتل کر دیا گیا۔ اُف فوہ۔ کہاں ہو آج کل تم لوگ کہ بندہ تین حالات سے بھی بے خبر رہتے ہو۔“

”آپ جانتے ہی میں مسٹر آصف کہ ہمارے پاس کس قسم کے کیس آتے ہیں۔“ حمید نے خلک بھجے میں کہا اور برآمدے سے اتر کر کینٹین کی طرف چل پڑا۔

آج کل وفتر میں قدم رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو فریدی کے سامنے بھی تعطیل کی تجویز پیش کی تھی لیکن فریدی نے خس کر ٹال دیا تھا اور اب حالات کم از کم حمید کے لئے تو ناقابل برداشت ہی ہو کر رہے تھے۔

وہ کینٹین کے چھوٹے سے صاف سترے ڈائینگ ہال میں داخل ہوا۔

اُسے اس حداثے کا علم تھا۔ کونکہ اُس کی موجودگی ہی میں نے ڈی۔ ایس۔ پی نے ان پکڑ سعید اور سب انپکٹر حامد کو جائے واردات پر بھیجا تھا۔ لیکن اس نے حداثے کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ فریدی ہی سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فریدی کو بھی اس واردات کا علم تھا یا نہیں۔

ڈائینگ ہال میں سارجنٹ توفیق پر نظر پڑی جو بکٹوں کے ٹکڑے جلدی جلدی حلقت سے اتارتا ہوا چائے کے گھونٹ لے رہا تھا۔ اس نے حمید کو دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور حمید کے قدم غیر ارادی طور پر اُس کی میز کی جانب اٹھ گئے۔

سارجنٹ توفیق بھی دونوں انپکٹروں کے ساتھ جائے واردات پر گیا تھا۔

”مگر چھن گئی ہے استاد۔“ اُس نے منہ چلاتے ہوئے باہم آنکھ دبا کر کہا۔

”مکیا ہوا....!“ حمید نے کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہوئے پوچھا۔

”میں ڈیٹی صاحب کو اطلاع دینے آیا تھا۔“

الْوَأْرَاقْلِيدِس

ان دونوں بھائی میں فریدی کی مخالفت کا براہمود تھا۔ پرانے حاکم کے چادلے ہو گئے تھے۔

حاکم کو نئی جگہ بھرم بنائے رکھنے کا خیال ہوتا ہے اس لئے وہ کیسے گوارہ کر لیتے کہ ایک ماتحت آفسر کا توقیق اُن پر بھی برقرار رہے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ جانتے ہی تھے کہ مرکزی بھکر صرف کرع فریدی کا نام ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی کسی سے پو شدہ نہیں تھی کہ فریدی اپنی ہی مرخصی سے اس معمولی سے عہدے پر نکلا ہوا ہے ورنہ کبھی کاپٹہ نہیں کہاں پہنچا ہوتا۔ اس معمولی سے عہدے پر بھئے رہنے کی وجہ بھی سب کو معلوم تھی۔ وجہ بھی تھی کہ وہ کام کرنا چاہتا تھا۔ فن سراغِ رسانی سے عشق تھا اسے اور بھی عشق بھکے تک لایا تھا۔ ملازمت برائے ملازمت کا سوال یوں نہیں پیدا ہوا تھا کہ اُس کی مالی حیثیت بہت بلند تھی۔

لیکن ان دونوں اُسے صرف دفتری امور تک محدود کر دیا گیا تھا۔ اُس نے خاموشی سے یہ تبدیلی گوارہ کر لی۔ اپنے افعال سے ذرہ برا بر بھی احتجاج نہ ظاہر ہونے دیا۔ البتہ حمید بے حد بور تھا۔ بور ہونے کی بات بھی تھی کیونکہ اُسے توانیتے بیٹھنے الگارے چبانے پڑتے تھے۔

اب اسی وقت جیسے ہی وہ کینٹین مک جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلا۔ انپکٹر آصف نے دور ہی سے لکار کر کہا۔ ”جناب پکستان صاحب... ذرا منے گا۔“

وہ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ برآمدے کے وسط میں دونوں رک گئے۔

”ارے تم لوگ ابھی یہیں ہو۔“ آصف نے تحریرانہ لجھ میں کہا۔

آفس بند ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی اس نے بقیہ وقت ڈائینینگ ہال میں گزار دیا۔ لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ فریدی کی آنکھ بچا کر کسی طرف نکل جاتا۔ کیونکہ اوہ رہ کیتیں سے باہر آیا اور اُوھر فریدی اپنے آفس سے برآمد ہوا اور اس نے اسے اپنے سماں چلنے کا ہی اشارہ کیا تھا۔ حمید نے سختی سانس لی اور آہستہ آہستہ اس شیڈ کی طرف چلنے لگا جہاں کارپارک کی جاتی تھیں۔ آج حمید اپنی گاڑی سے جیکیں آیا تھا۔

فریدی کے ساتھ لیکن میں بیٹھتے وقت وہ ہوتلوں ہی ہوتلوں میں کچھ بڑا یا بھی تھا۔

”کیوں! جانکی میں کیوں جتنا ہو۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرا لیا۔

”طبعت ٹھیک نہیں ہے۔“ حمید نے خشک لبجھ میں جواب دیا اور گاڑی کا انہیں ہلکی سی آواز کے ساتھ اشارت ہوا۔

حمدید پھر ڈاکٹر داؤد کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ لیکن اس نے اس کا تذکرہ جھیٹنے میں مناسب نہ سمجھا پچھوڑ دیر بعد اس نے فریدی سے کہا۔ ”آخر ہم کب تک کلرکی کرنے رہیں گے۔“

”اوہ.... تو یہ بات ہے۔“

”قطیعی امیری دامت میں تو لمبی چھٹی ہی مناسب رہے گی۔“ حمید بولا۔

”پھر اس کے بعد...!“

”دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا۔ ”مگر شائد ہم گھر کی طرف تو نہیں جا رہے۔ پھر کہا۔“ لیکن ہو یو شام روڑ پر مزردی تھی۔

”کو تو ایں...!“ فریدی نے وندشیلد پر نظر جائے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ.... ڈی۔ ایں۔ پی۔ شی کافون آیا ہو گا۔“ حمید نے کہا۔ ”ڈاکٹر داؤد اس کا رشتہ دار تھا۔“

”تمہارے پاس بھی کافی اطلاعات معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں ڈی۔ ایں۔ پی۔ نے پوچھا تھا کہ کیا میں اس کے لئے تھوڑا وقت نکال سکوں گا۔“

”اوہ آپ خود ہی کو تو ایں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔“

”کیا حرج ہے۔“

”میں اسے آپ کی شان کے خلاف بھجتا ہوں۔“

”بہت اپنھے۔“ فریدی نے بلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ابھی تک ہوش نہیں آیا حالانکہ کلرکی کرتے

”کیسی اطلاع...!“

”ڈاکٹر داؤد قتل کر دیا گیا۔ جانتے ہی ہو گے۔“

”ہاں معلوم ہے مجھے تم سعید اور حامد کے ساتھ گئے تھے۔“

”وہ بڑی بے ملکی حرکتیں کر کے مرابے۔“ توفیق نے آنکھیں نکال کر کہا۔

”کیا...؟“

”اُس نے کو تو ایں فون کیا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ شائد وہ ڈی۔ ایں۔ پی۔ شی۔“ رشتنے دار بھی تھا۔ ڈی۔ ایں۔ پی۔ خود ہی دوڑا گیا اور جب وہ وہاں پہنچا تو ڈاکٹر داؤد کو قریش پر ایکیں رکھتے دیکھا۔ اُس کا بیان ہاتھ سینے کے زخم پر تھا اور وہ کہیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا ڈی۔ ایں۔ پی۔ نے چھوٹے ہی پوچھا کہ جملہ آوز کوں تھا اور اُو نے چیخ کر کہا آؤ آؤ۔ پھر وہ آکو رہتا رہا اور فرش پر پھیلے ہوئے خون میں انگلی ڈبو کر اس نے ایک ملٹٹ اور دارہ جعلیا۔ اور پھر... مر گیا۔“

”خوب....!“ حمید کے ہوتلوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ نظر آئی۔

”تاب.... یہ ملٹٹ.... یہ دارہ.... اور آلو.... حامد صاحب اور سعید صاحب کو چکر دے رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر داؤد نے اپنی زندگی میں بھی کسی آکو دارہ یا ملٹٹ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ ریاضی دان ہی نہیں۔“

”نہیں.... پیدا ہے۔“ توفیق بھی کر بولا۔ ”اب دیکھا ہے کہ کر قتل صاحب کے بغیر کیے کام چلتا ہے۔“

”حمدید نے لاپرواں سے شانوں کو جبکش دی اور مزکرویٹر سے چائے لانے کو کھلدا۔“ توفیق کو شائد اس کی بے توجیہی اور لاپرواں پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا پھر انتہا ہوا بولا۔ ”اب پھر ہیں جانا ہے۔“

”حمدید نے سر کو خفیہ سی جبکش دی اور میز پر انگلیوں سے ہلکی ہلکی ضربیں لگانے لگا۔“

”پہنچنیں تو توفیق کے بیان میں کہاں تک صداقت تھی۔ اُس نے سوچا اگر دائرے ملٹٹ اور آلو کی کہانی درست تھی تو فریدی (نجی ہی طور پر سہی) اس کیس میں دلچسپی لینے سے بازنہ آسکے گا۔“

”پھر آگ لگانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جائے واردات کا معافی کرنے کرتے انگلیاں گھسی جا رہی ہیں۔“

”جیہد کچھ نہ بولا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی مخفی معلومات حاصل کرنے کو تو ای جارہا ہے۔ ورنہ شائد اس نے گھر ہی پر ڈی۔ ایس۔ پی کا انتظار کیا ہوتا۔“

”اویں نے کسی خاص چیز پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ ضائع کر دی گئی۔“
اویں نے کوئی ٹھیک موذل کالوں کے ایک دور افتادہ حصے میں واقع تھی۔ آس پاس اور کوئی ڈاکٹر، داؤڈ کی کوئی ٹھیک موذل کالوں کے ایک دور افتادہ حصے میں واقع تھی۔ آس پاس اور کوئی عمارت نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے یہاں عمارت بنوانے میں ریاضی داں کی بکون پسندی ہی کو دخل رہا ہو۔ پوری عمارت سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور آس پاس آدمیوں کا جم غیر نظر آ رہا تھا لیکن کہیں بھی کوئی آگ بھانے والی گاڑی نہ دکھائی دی۔“

”آگ بھانے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔“ فریدی گاڑی روک کر نیچے اترنا ہوا بولا۔

اصل گنگو شروع کرنے سے پہلے اس نے اس بات پر حرمت ظاہر کی کہ فریدی جائے واردات پر نہیں آیا تھا۔
ایک پولیس کا نشیل جمع سے گزرنے کے لئے جگہ بنا نے لگا اور وہ عمارت سے تمٹوئے ہی فاصلے پر رکے۔ یہاں وہ ایس آئی موجود تھا جس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو فون پر اطلاع دی گئی۔
ڈی۔ ایس۔ پی اس پر برس پڑا۔ ”تم کھڑے و سیکھتے ہی رہے اور پوری عمارت میں آگ لگ گئی۔“
”فارا شیشن کو فون کئے گئے ہیں جتاب۔“ ایس آئی نے کہا۔ ”لیکن اس وقت ان کے پاس ایک بھی گاڑی نہیں ہے۔ سب گاڑیاں پہلے ہی سے کہیں جا چکی ہیں۔ اس وقت شہر کی کئی عمارتیں جل رہی ہیں۔“

”اوہ....!“ فریدی کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سٹ گئے اور ڈی۔ ایس۔ پی اس کی طرف ٹڑک۔

”اے بھی بے بی ہی کہنا چاہئے۔“ فریدی بولا۔

”آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شہادت ضائع کی گئی ہے۔ ورنہ ایک ہی شہر میں بیک وقت آتشزدگی کی اتنی وارداتوں کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ مدد لینے میں دیر لگے اور پوری عمارت خاک کا ڈھیر ہو جائے۔“

فریدی ایس آئی سے سوالات کرنے لگا۔

”آپ اس وقت کہاں تھے جب آگ لگی تھی۔“

”ورا نگر روم میں جتاب۔“

”کیسے علم ہوا تھا....؟“

”کسی کا نشیل نے کہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کون تھا۔ آگ عمارت کے پچھے ہے“

کرتے انگلیاں گھسی جا رہی ہیں۔“

”جیہد کچھ نہ بولا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی مخفی معلومات حاصل کرنے کو تو ای جارہا ہے۔ ورنہ شائد اس نے گھر ہی پر ڈی۔ ایس۔ پی کا انتظار کیا ہوتا۔“

”شائد ڈی۔ ایس۔ پی کو بھی موقع نہیں تھی کہ فریدی خود ہی چلا آئے گا۔ اسی لئے ان کا استقبال بڑے پر تپاک انداز میں ہوا تھا۔“

”کرتل! میں بے حد مشکور ہوں۔“ ڈی۔ ایس۔ پی نے گرجوش مصافحہ کے ساتھ کہا۔

اصل گنگو شروع کرنے سے پہلے اس نے اس بات پر حرمت ظاہر کی کہ فریدی جائے واردات پر نہیں آیا تھا۔

”آج کل میں زیادہ تر آفن درک کر رہا ہوں۔“ فریدی بولا۔

وفعتاً میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی اور ڈی۔ ایس۔ پی نے رسیور اٹھایا لیکن دوسرا بے ہی لمحے میں وہ ماڈ تھے پیس میں چینا۔ ”کیا؟“

اُس کی آنکھیں حرمت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پکھ سنتا رہا پھر رسیور کریئل پر پہنچا ہوا بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب کی کوئی ٹھی میں آگ لگ گئی۔“

”کس نے اطلاع دی ہے۔“

”ایک ایس آئی نے جو دہاں موجود تھا لاش اٹھانے کے بعد وہاں سامان کی فہرست مرتب کرنے کا کام ہوا تھا۔“

”نکیا وہ مکان میں تھا رہتے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہا۔“

”اور ہب تو ہمیں دیرہ کرنی چاہئے۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”ورنہ ہو سکتا ہے کہ بعض بہترین شہادتیں ضائع ہو جائیں۔“

پھر تھوڑی دیر بعد ایک پڑول کار کو تو ای کے چھالک سے باہر نکلی جس کے پیچے فریدی کی انکن تھی۔

فریدی بڑا رہا تھا۔ قیمتی کوئی اہم ترین شہادت ضائع ہو گئی۔

”قبل از وقت کیسے کہا جا سکتا ہے۔“ جیہد بولا۔

مظہر بانہ انداز میں کہا۔ ”بھی میں نے قریب تی کہیں کوئی فائزہ بیند رفت علاش کرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آس پاس ایک بھی نہیں ہے ورنہ اُسی سے ہم خود ہی کچھ کام لے سکتے؟“

”آپ اُسے خاک کا ذمہ بھر جانے سے نہیں بچا سکتیں گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کوئی سب کچھ ایک سوچی سمجھی ایکیم کے تحت ہوا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر داؤڈ بہت سمجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ ایسا نہیں تھا۔“ ذی۔ ایس۔ پی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”وہ بھگڑا لو بھی تھے اور دوسروں کے معاملات میں داخل اندازی کی بھی عادت تھی۔“

”آپ ان کے مرنے سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے۔“

”ہاں انہوں نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ خطے میں ہیں لیکن انہوں نے فون پر تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بن ہدیاں انداز میں بھی جیخت رہے تھے فوراً پہنچو... فوراً پہنچو...!“

”بہت زیادہ خاکہ تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں! آواز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔“ ذی۔ ایس۔ پی بولا۔ ”اور جب میں یہاں پہنچا تو وہ ایک کمرے میں زمین پر لوٹ رہے تھے۔ گولی میں پر گلی تھی اور خون فرش پر چھیل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس وقت ہوش ہی میں تھے۔ لیکن قاتل کے متعلق استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی ذہنی حالت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔“

”کیوں....؟“

”قاتل کے متعلق پوچھنے پر ان کی زبان سے اُنکا تکالیف۔ اور پھر وہ اُبھی اُلورٹہ رہے تھے گر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض لوگوں کو اپنے مشاغل سے جنون کی حد تک عشق ہوتا ہے لیکن میں اسے جنون سے بھی زیادہ کوئی اور چیز سمجھوں گا اگر مررتے وقت بھی ان مشاغل کا دھیان رہے یا مررتے مررتے بھی انہیں مشاغل ہی سے متعلق کوئی حرکت سر زد ہو جائے۔“

”میں نہیں سمجھتا۔“

”جب میں نے ان سے قاتل کے متعلق پوچھا تھا تو وہ ایک طرف تو اُلوں اور مٹتے رہے تھے اور دوسرا طرف اپنے خون میں انگلی ڈبوڈ بکر فرش پر ایک مثلث اور ایک دائرہ بھی بنایا تھا۔“

”خوب....!“

سے شروع ہوئی تھی۔“

”کچن سے....!“

”جی نہیں! کچن تو اس وقت محفوظ تھا۔ ہم عمارت سے نکل آئے تھے۔ پھر کالوںی کے پورے آفس سے فائزہ اسٹیشن فون کیا گیا تھا۔“

پھر فریدی نے اس کا نشیبل کے لئے پوچھ چکھ شروع کی جس نے اسی آئی کو اطلاع دی تھی وہاں چھ سات کا نشیبل تھے جن میں سے ایک نے اعتراف کیا کہ اُسی نے آگ کے متعلق اسیں آئی کو بتایا تھا۔

”تم کہاں تھے؟ اور نہیں کیسے معلوم ہوا تھا؟“

”میں چالاک پر تھا حضور! ایک را گیر نے اطلاع دی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا عمارت کی پشت سے آیا تھا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ جا کر دیکھا۔ پچھلے حصے میں آگ لگی تھی۔ پھر میں نے صاحب کو اطلاع دی۔“

”میا تم نہیں جانتے کہ آگ لگنے کی اطلاع دینے والے کو روک رکھنا چاہیے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا حضور۔“ کا نشیبل گھکھلایا۔

”اگر اسے دوبارہ کہیں دیکھو تو پہچان لو گے۔“

”ضرور پہچان لوں گا۔... جناب عالی۔“

فریدی حیدر کی طرف مراجوا بھی ابھی موذل کالوںی کے پوسٹ آفس سے واپس آیا تھا۔

”اب بھی اسٹیشن پر کوئی گاڑی موجود نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”تب پھر کوئی صورت نہیں رہ گئی۔“ فریدی نے شانوں کو جنمیں دی۔ آگ قابو سے باہر ہو چکی ہے۔

مارت جلتی رہی اور وہ کھڑے دیکھتے رہے۔ دروازے اور کھڑکیاں ترخ ترخ کر گر رہے تھے اور گہر ادھوں جس میں بہت اونچائی تک آگ کی لیٹیں بھی شامل ہوتی تھیں، آسمان سے باتمن کر رہا تھا۔ لوگ چیز رہے تھے اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی!

”میا کوئی ملازم بھی ساتھ نہیں رہتا تھا۔“ فریدی نے ذی۔ ایس۔ پی سے پوچھا۔

”نہیں وہ تنہار ہے تھے۔ اور ان کی مالی حالت بہتر نہیں رہی تھی۔“ ذی۔ ایس۔ پی نے

کہیں اب بھی کثیف دھوئیں کے سر غولے انہر ہے تھے اور لپٹیں بھی اٹھتی رکھائی دیتی تھیں۔
کچھ فائز فائز زہاں فائزہ اسٹر نٹ علاش کرتے پھر رہے تھے تاکہ مزید یانی حاصل کر کے کام چلایا
جائے۔

“آپ نے یہ تو یقیناً معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گئی کہ وہ کس کا کارنون تھا۔” فریدی نے پوچھا۔

“قدرتی بات ہے۔ لیکن مجھے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔”

ان کے احباب کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے۔ چند ایک کے نام اور پتے بھی دے سکیں
تو بہتر ہو گا۔”

“حلقة احباب نہ مخصوص تھا اور نہ محدود۔ روزہ ہی نئے نئے احباب بناتے تھے۔ اور سازی
آدمی احباب نوازیوں کی نذر ہو جاتی تھی اور وہ ہمیشہ مالی تباہ حالی کا روتارو تے رہتے تھے۔ ویسے میں
آپ کو چند نام اور پتے بھجوادوں گا۔”

“شکریہ...!“ فریدی نے تشویس کرنے لجھ میں کہا۔ لیکن مجھے بھی طور پر کام کرنا پڑے گا۔
مجھے سے شاید ہی اجازت ملے۔”

“کچھ سمجھ کر قتل! میں بے حد پریشان ہوں وہ دراہن یگم صاحبہ کے ماموں تھے۔ جب سے
انہوں نے سنا ہے بہ احوال ہے۔”

چند لمحے خاموشی سے گزرے پھر فریدی نے پوچھا۔ ”وارہ اور مشاث الگ الگ بنائے تھے یا
مشاث دائرے کے اندر تھیا پھر اس کے بر عکس۔“

”دونوں الگ الگ تھے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا...!“

”ایسے وقت میں ذہنی حالت پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ فریدی بولا۔ ”خیر نہیں دیکھوں گا۔“
رات گئے وہ دونوں واپس ہوئے۔ فریدی کی جیب میں ڈاکٹر داؤڈ کے چند دوستوں کے نام
اور پتے موجود تھے۔

”بڑی شدت ہے۔“ خلافت ہو گئی اگر آپ نے اس کیس میں ہاتھ لگایا۔“ فریدی نے کہا۔
”میں جانتا ہوں۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”لیکن آپ بخی طور پر تلقیش ضرور کریں گے۔“

”بھئی کلر کوں کو بھی حق حاصل ہے کہ فرمت کے اوقات میں تفریغ کریں۔“

”اور اسی حالت میں ان کا جسم سرد پر گیا تھا۔“

فریدی کسی سوچ میں پڑ گیا اور اسی وقت آگ بجانے والی گاڑیوں کی گھنٹیاں سنائی دیں۔

”اب کیا باقی بچا ہے۔“ حمید نے جلتی ہوئی عمارت کی طرف دیکھ کر کہا۔

آگ بجانے والی گاڑیاں اپنے کام میں لگ گئیں اور وہ لوگ مجھ سے باہر آگئے! کاشیل ہم
ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ سو شل آدمی بھی نہ رہے ہوں گے۔“ فریدی نے
ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا۔

”بہت زیادہ سو شل تھے۔ میں انہیں عجیب ہی کہوں گا۔ ریاضی داں عموماً نہ کل طبیعتیں رکھتے
ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اُن سے بہت مختلف تھے۔ گانے بجانے کا شوق بھی تھا۔ اچھی خاصی کے
موڈلنگ بھی کر لیتے تھے.... اوہ....!“

یک بیک ڈی۔ ایس۔ پی خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔
حمد نے اُس کی آنکھوں میں اضطراب کہ لہریں بھی محسوس کیں۔

”فعلاً ڈی۔ ایس۔ پی نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے اُن کا بنا یا ہو! ایک بتیا د آرہا ہے۔“
وہ کسی سوچ میں پڑ گیا پھر اس طرح بولا جیسے خود سے مخاطب ہو۔ ”اکو... اکو... کیا اس کا
اس سے بھی کوئی تعلق تھا۔“

فریدی اُسے استغفاریہ نظر دی سے دیکھ رہا تھا۔ ”جی ہاں...!“ ایس۔ پی پھر اس کی طرف
دیکھ کر بولا۔ ”میں اور پلاسٹر آف پیرس کا بات۔ جس کا پھرہ آدمیوں کا ساتھا لیکن بقیہ جم
پر نہ رکے کاک بس وہ آلو یعنی معلوم ہوتا تھا! گول پھرہ عجیب سی بھنوں اور آلو کی چونچ کی سی ناک۔“

”آپ نے اُسکے متعلق ضرور پوچھا ہو گا۔“

”ہاں... پوچھا تھا۔ وہ ہنسنے تھے اور صرف ”ایک کارنون“ کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔“

تعاقب

آگ بجانے والی گاڑیاں کی ٹکنیاں خالی ہو گئیں لیکن آگ پوری طرح نہ بھج سکی۔ کہیں

بلد نمبر 27
کو پولیس وہاں موجود تھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس قسم کے خطرات اُسی حالات میں مول کے پولیس وہاں موجود تھی لئے کوئی دوسرا ری Zahad نہ ملے۔ جائے واردات کا معاهدہ کرنے والوں کی لئے جاتے ہیں جب بچاؤ نکے لئے کوئی دوسرا ری Zahad نہ ملے۔ اپر وائی کی بناء پر کو شکست اور دائرے والی بات قبل از وقت عمارت کے باہر آگئی تھی۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ یہی آتشزدی کا موجب تھی ہو۔

”ہوں.... اس کے امکانات توییں۔“ حیدر سر ہلا کر بولا۔ ”اب بات سمجھ میں آئی ہے۔ تب پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الوکا مجسمہ ہی وہ اہم شہادت رہی ہو جس کی بناء پر مجرم کی شخصیت روشنی میں آجائی۔“

”فی الحال یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔“

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ حیدر نے پوچھا کیونکہ فریدی نے لکن گرینگ روڈ پر موڑی تھی۔ ”میرے پاس ایک پیشہ ور مجسمہ ساز کا پتہ بھی ہے۔ اس سے ذاکر کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اس کا شوروم اسی سڑک پر ہے۔“

کچھ دو رچن کر لکھن بائیں جانب والے فٹ پاٹھ سے جاگی۔ فریدی نے انہیں بند کر دیا اور نیچے اتر آیا۔ اب وہ مجسموں کی ایک بڑی دوکان میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک پتہ قد اور عمر آدمی نے ان کا استقبال کیا۔

فریدی اس طرح شوکیں میں رکھے ہوئے مجسموں کا جائزہ لے رہا تھا جیسے کسی خاص مجسمے کی تلاش ہو۔ یہاں زیادہ تر ملک کے بڑے آدمیوں کے مجسمے نظر آرہے تھے۔ شعر افلمیوں اور سیاست دانوں کے مجسمے۔

”فرمایے جناب۔“ بوڑھے آدمی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے نصیری صاحب سے ملتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”فرمایے! جناب بھی خادم ہے۔ کیا آپ اپنا مجسمہ بنوائیں گے۔“

”نہیں.... مجھے ایک ایسا مجسمہ چاہئے جو دلچسپ ہو۔“

”میں نہیں سمجھا جناب۔“

”مطلوب یہ کہ جسے دیکھ کر بھی آئے۔ جس نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا اُسی کے ہمراہ میں نے

”مگر یہ لکر بیمار پڑ جانا چاہتا ہے۔“ حیدر نے میں پرہاٹھ رکھ کر کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم بیمار نہ پڑے تو میں تمہاری ناگہتی توڑ کر بٹھا دوں گا۔“ ”کیا آپ کی دانست میں اُموثیت اور دائرہ کلیو بھی ہو سکتے ہیں۔“ ”قطیعی ہو سکتے ہیں۔“

”اگر وہ ہوش میں نہ رہا ہو تو۔“

”تب ہی تو کلیو ہو سکتے ہیں! ورنہ ہم اُسے سیدھا سادھا سایاں تسلیم کر لیتے۔ یقیناً اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن جو کچھ بھی اس کی زبان سے لکھا تھا یا جو کچھ بھی اس کے کسی خاص فعل کا نتیجہ تھا اسے کیا تم ذہنی ہی سے متعلق نہ سمجھو گے؟“

”یقیناً سمجھوں گا لیکن اکیا اتفالیں آپ کو کدر لے جائیں۔ ذہنی۔ ایس۔ پی نے قاتل کے متعلق استفسار کیا تھا۔ اس نے کہا الو پھر میثاث اور دائرہ بنا کر رکھ دیا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ان بے قاتل پر روشنی پڑیں۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تو وہ یا تو قاتل کا نام بتاتا یا لا علمی ظاہر کرتا۔ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی تو ہو سکتا ہے کہ الو اور میثاث ذہنی۔ ایس۔ پی کے سوال کا جواب ہی نہ رہے ہوں۔“

”لیکن اُن کا کچھ نہ کچھ تعلق اُس اذیت سے ضرور ہوتا چاہیے جس کی بناء پر اس کی ذہنی حالت متوازن نہیں رہی تھی۔“

”تو پھر پیدا کیجئے تعلق۔“ حیدر نے اکتا کر کہا۔ پھر یہ بیک چوک کر بولا۔ ” ذہنی۔ ایس۔ پی نے کسی مجسمے کا تذکرہ بھی تو کیا تھا۔“

”ہاں! لیکن افسوس ہے کہ ہم اُسے نہ دیکھ سکے۔“

حیدر پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ وہ جلتی ہوئی عمارت کے متعلق سوچ رہا تھا جیسے اس نے راکھ کاڈھیز ہوتے بھی دیکھا تھا۔ وہاں اب کیا باتی پچاہو گا۔ کبھی کچھ تو ضائع ہو گیا۔ لیکن محل آور نے اُس پر فائز کرنے کے بعد ہی آگ کیوں نہیں لگادی تھی۔ اگر اُسے کچھ شہادتیں ضائع کرنی تھیں۔ آخر پولیس کی موجودگی میں اس کا خطہ کیوں مول لیا؟ یہ ایک ضروری سوال تھا۔

اس سوال پر فریدی کے ہوننوں پر بلکی ہی مکراہت نظر آئی اور اس نے کہا۔ ”اسی سوال نے مجھے الو، میثاث اور دائرے کے کو اہمیت دینے پر مجبور کیا ہے۔ عمارت میں اُس وقت آگ لگا جا ب

میں سے ایک کھڑکی کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔
”ویکھو....!“ فریدی نے آہستہ سے حمید کو مخاطب کیا۔ ”ہم یہاں بس یونہی چلے آئے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید نے تشویش کن انداز میں سر کو جنبش دی۔
”ذرا ہی کی دری میں کئی پولیس کاریں وہاں پہنچ گئیں۔ ذی۔ ایس۔ پی۔ ٹھیک آیا تھا۔“

فریدی نے اُسے علیحدہ لے جا کر کہا۔ ”یہ کوئی گھری سازش ہے۔ میں اُس سے اسی مجھے کے متعلق پوچھ گجھ کر رہا تھا۔“

”اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ قاتل وہیں سے آپ کا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا۔“

ڈی۔ ایس۔ پی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”مجی ہاں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکے گا۔ لیکن سنئے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لئے اس کیس کی تفتیش کروں تو اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کبھی گا کہ میں آپ سے اس کا پتہ معلوم کر کے یہاں آیا تھا۔“

”تو گویا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق ذاکر کے کیس سے نہ ظاہر کیا جائے۔“

”مجی ہاں.... میں یہی چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے.... اس طرح شائد نصیری کا کیس باضابطہ طور پر آپ کو مل جائے۔“

ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔
”ہرگز نہیں۔“ فریدی مسکرا کیا۔ ”اس کا خیال ہی فضول ہے، چونکہ قتل میری موجودگی میں

ہوا ہے اس لئے شاید میرے ہی خلاف تفتیش شروع کر دی جائے۔“

”نہیں....!“ ڈی۔ ایس۔ پی کے لامجھ میں حرمت تھی۔

”مجی ہاں.... اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے میں جو کچھ بھی کروں گا اس کا مقصد دراصل ذاکر داؤد کے قاتل ہی پر ہاتھ ڈالنا ہو گا۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجھے میں آپ کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بھی کچھ سناتا ہا۔“

”ذاکر ایسا بھی ہوتا ہے۔“ فریدی مسکرا کیا۔ پھر بولا۔ ”آپ فنگر پر نہ سیکشناں والوں کو طلب

ایسا یعنی ایک محمد دیکھا تھا۔“

”کس کے ہاں۔“ بوڑھے کی پیشانی پر ٹکنیں اُبھر آئیں۔

”ڈاکٹر داؤد کے یہاں...؟“

”اوہ.... مگر وہ مجسمہ کیسا تھا۔“

”سر آدمی کا اور دھڑپر نہ دے کا۔ لیکن چہرے کی بنادوت بالکل اُلوکی سی تھی۔“
حمدید بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ ابھی اُسے ذاکر داؤد کے قتل کی اطلاع نہیں ملی۔ ورنہ وہ اُس کے ذمہ کرے پر اتنا پر سکون نہ کھانی دیتا۔ لیکن جیسے ہی فریدی نے مجھے کے متعلق تفصیل ظاہر کی اُس کے چہرے کارنگ اڑ گیا۔

”مم.... میں.... ایسے بُت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ ذاکر داؤد خود ہی کلے موڈل نگ کرتے تھے۔ اچھے آرٹسٹ تھے۔ انہوں نے خود ہی بنا لیا ہو گا۔“

”مجی ہاں.... انہوں نے خود اس بنا لیا تھا اور مجھے مشورہ دیتا تھا کہ میں سیماں میں سے اُپ سے بخواں۔“

”بھلامیں کیسے بناسکتا ہوں جناب۔ مم.... میں نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کچھ خاکب سے نظر آ رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا اور پھر یک ٹیک، اچھل کر پچھے ہٹ آی۔ باہمیں جانب والی کھڑکی سے ایک فائز ہوا تھا۔ بوڑھے کی پیچے دوکان کی محدود فضائیں گوئی۔

”ویکھو....!“ فریدی نے بوڑھے کی طرف ہاتھ اٹھا کر حمید سے کہا اور دروازے سے فٹ پاٹھ پر چھلانگ لکائی۔

حمدید بوڑھے کی طرف جھپٹا جو فرش پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ گول اس کی داہنی کپٹی پر گلی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دم توڑ دیا۔ گویی لگنے کے بعد اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ کہا تھا۔

فٹ پاٹھ پر بھیڑ لگ گئی۔ حمید نے مجھ بھانے کے لئے ایک ڈیوٹی کا نیشنل کو بلائی۔ فریدی گلی میں تھا۔ کچھ دیر بعد دوکان میں واپس آ کر اُس نے کو توںی فون کیا۔

گلی میں تین ڈیوٹی کا نیشنل موجود تھے، جنہوں نے گلی سے آمد و رفت روک دی تھی۔ ان

”تو کیا وہ اس بناء پر مارا گیا کہ آپ کو بچانا تھا۔“
 ”نہیں صرف اس لئے کہ میں اس کے ذریعے کسی کو بچان لوں گا۔ نصیری بہت دنوں سے
 میری لست پر تھا فرزند۔“
 ”میرا مطلب...!“
 ”غیر پسندیدہ اور مشتبہ عناصر کی لست پر لیکن ڈاکٹر داؤد کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“
 ”تو کیا آپ اسے بھی اس لست میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ حمید نے حرمت سے کہا۔
 ”میرا خیال ہے کہ مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“
 ”اُلوں کے تذکرے سے نصیری خائف نظر آنے لگا تھا۔“ حمید نے کہا۔
 ”شائد وہ ہمیں بہت بچھتا تھا۔“
 ”میں تو صاحب اب ملکر کسی ہی میں خوش ہوں۔“ حمید نے مختدی سائنس لی۔ وہ تو آپ کا
 منہ دیکھ کر مجھے ان پابندیوں پر غصہ آ جاتا ہے۔“
 ”اوہ ہو! تو تم نے حسب عادت بھاگ دوڑ پہلے ہی سے سونگھا لی۔“
 ”ویکھے!“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”ہوں کیا کہنا چاہتے ہو۔“
 ”جو لوگ پولیس کی موجودگی میں کسی عمارت میں آگ لگا سکتے ہوں یا ہماری نظروں کے
 سامنے نصیری کو قتل کر سکتے ہوں کیا وہ ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کریں گے؟“
 ”یقیناً کریں گے۔ میں یقیناً کہنا چاہتا ہوں۔“
 ”لیکن میں اپنے سہرے کے علاوہ اب اور کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔“
 ”موت سے ڈرتے ہو۔“ فریدی مسکرا یا۔
 ”شادی سے پہلے یقیناً ڈرتا ہوں۔ پھر شادی کے بعد بھلاموت کہاں آتی ہے۔ ارے ارے
 اب یہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔“

”کسی ایسکی جگہ جہاں اندازہ کر سکوں کہ تعاقب اب بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔“
 ”حمد نہ پچھنے یو لا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی کو کسی کام سے باز رکھنا ممکنات میں سے ہے۔ فریدی
 کا قول تھا کہ موت کی تلاش میں رہنے والوں سے موت ہمیشہ دور بھاگتی ہے۔ یا کم از کم ویسی موت

کر کے کھڑکی پر نشانات تلاش کرائے اور دوکان کی تلاشی بچھے۔ مگر یہ تلاشی آپ کی ذمہ داری پر
 ہو گی۔ میں صرف ساتھ رہوں گا۔“
 ”ٹھیک ہے... میں سمجھتا ہوں۔“ ذی۔ ایس۔ پی نے تشویش کن انداز میں سر ہلا کر کہا۔
 لیکن فریدی اس تلاشی میں شریک نہ ہو سکا کیونکہ اس کے ملکے کا نیا لست۔ پی بھی وہاں پہنچ
 گیا تھا اور شاید وہ اسی اطلاع پر آیا تھا کہ واردات فریدی کی موجودگی میں ہوئی تھی۔
 ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ ایس۔ پی نے پوچھا۔
 ”لیں یوں ہی۔ ایک پاپولر جسکسکی تلاش تھی۔“
 ”آپ ڈاکٹر داؤد کی کوٹھی پر بھی موجود تھے۔ میرا مطلب ہے آگ لگنے کے بعد۔“
 ”جی ہاں۔ صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے۔“ فریدی نے لاپرواں سے کہا۔
 ”آپ کو معلوم ہے کہ اوپر کے آرڈر کتنے سخت ہیں۔“
 ”جی ہاں مجھے علم ہے۔ مگر میں نے کوئی بے ضابطہ مداخلت تو نہیں کی۔“
 ”ذی۔ ایس۔ پی کی شی نے آپ کا تحریری بیان لیا ہیں۔“
 ” غالباً مجھے اسی لئے روکا گیا ہے۔“

فریدی نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھڑائے لیکن وہ اسے باتوں میں الجھائے ہی
 رہا اور اس دوران میں ذی۔ ایس۔ پی کی تلاشی نے کہا بہر بھی آگیا۔
 اپنے ملکے کے ایس۔ پی کی موجودگی ہی میں فریدی کو وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔
 ذی۔ ایس۔ پی بے گفتوگ کرنے کا موقع کہا تھا۔
 ”اب فرمائیے۔“ حمید نے لٹکن میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”ویکھتے جاؤ۔“ فریدی انجمن اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔ ”میں خود کو بے بس سمجھنے کا عادی نہیں ہوں۔“
 ”بے بس تو وہ مر بنے والا بھی نہیں تھا۔“ حمید نے چھتے ہوئے جگہ میں کہا۔
 اور فریدی صرف نہیں کر خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ”کیا خیال ہے تھا را... نصیری ہمیں
 بچانا تھا یا نہیں۔“
 ”اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔“

”قطیعی بچانا تھا۔ لیکن شاید اسے ڈاکٹر داؤد کے قتل کے بازے میں نہیں معلوم تھا۔“

اس نے دروازہ کھول کر بائیں جانب چلا گئی اور لڑکتا ہوا نشیب میں چلا گیا۔ پھر بھل تمام سفینے میں کامیاب ہو سکا۔ یقین تھا کہ جسم پر خراشیں آئی ہی ہوں گی۔ لیکن ان کی سوچ محسوس کرنے کا ہوش کے تھا۔ مطلع ابر آلو ہونے کی وجہ سے اتنی گہری تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دیتا تھا۔ یہاں سے سڑک کی بلندی تقریباً پندرہ فٹ ضرورتی ہو گی۔ لیکن حمید کسی کار کی صرف آواز ہیں کار نہیں دکھائی دی تھی۔ البتہ ہیئت یمپس کی روشنی درختوں پر جھلکیاں مارنی تکلیفی تھی۔ تو وہ گاڑی کے بغیر رکے ہی گذر گئی۔ حمید نے سوچا اور اُسے فرید کی کبوتری اہمیت پر تاؤ آئے کا۔ خواہ مخواہ چوٹیں بھی کھائیں اور کپڑے بھی تباہ کئے۔

یک بیک قریب ہی اُسے سربراہیت سنائی دی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لیکن دوسرے عیلمے میں اُس نے فرید کی آواز سنی۔ ”کہاں ہو۔“

”آغوش باور میں۔“ حمید جھلا کر بولا اور پھر پہلی ہی خاموشی چھاگئی۔ مگر یہ خاموشی بے وجہ نہیں تھی۔ وہ ضرور ناخاموش ہوئے تھے۔ کیونکہ اب پھر کسی کار کی آواز سنائی دی تھی اور روشنی بھی نظر آئی تھی۔ اُنے واپی کاروں ہیں رکی جہاں انہوں نے اپنی کار چھوڑی تھی۔

”نہیں یہ گاڑی نہیں ہے۔“ انہوں نے کسی کو کہتے سنے۔ ”اوہ... اسکی تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ ”یقیناً یہ گاڑی نہیں ہے۔“ یہ دوسری آواز تھی۔

”کہیں ہم پھنس تو نہیں گئے۔“ فرید کی آواز آئی جس کے جواب میں انہوں نے کچھ بھی نہ سنا۔

الوکا خوف

فریدی نے حمید کا شاند دبایا اور پھر وہ دونوں آہستہ چڑھائی پر رینگنے لگے۔ جلد ہی انہیں ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں سے وہ سڑک پر بہ آسانی نظر رکھ سکتے تھے۔ آنے والی کار کی روشنیاں بھی گل کر دی گئی تھیں اور سڑک پر تین دھنڈے سائے نظر آرہے تھے۔ ”تمہیں خواہ مخواہ وہم ہو رہا ہے۔“ کوئی بولا۔ ”ہو سکتا ہے یہ گاڑی قطعی غیر متعلق ہو۔“

تو انہیں بھی نہیں فسیب ہوتی جیسی وہ چاہتے ہیں۔ تو پھر موت کے معاملے میں جواریوں ہی کا رویہ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔

ایک نہیں ہزاروں اس پر تھیں رہا کرتے تھے کہ آخر وہ اب تک زندہ کیوں ہے۔ اُس کے تواحد اوپر دشمن تھے اور آئے دن اس کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔

خود حمید ہی نے اُسے بیکاروں بار موت کے جڑوں سے صحیح و سلامت نجٹے دیکھا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ حمید بھی جان بوجھ کر انہیں کنوں میں چلا گئے لگادینے کا قائل رہا ہو، نہ وہ حقیقت بزرگ تھا اور نہ کام چور۔ لیکن خواہ مخواہ کسی الجھن میں پڑنے سے گریز کرتا تھا۔ اُس وقت وہ تھا ہو تو گاڑی کو کسی دیرانے کی طرف موڑنے کی بجائے بھری بھری سڑکوں ہی پر چلا۔ لیکن اب اُنکن ایک سنسان سڑک پر دوزر ہی تھی جس کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے درختوں کی قطاریں تھیں اور ان کے بعد پھر شاند کھیتوں اور جنگلوں ہی کے سلسلے پھیلتے چلے گئے ہوں۔ حمید نے مڑ کر دیکھا۔ یقینی طور پر تعاقب ہو رہا تھا۔

”ہے تا...!“ فریدی نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یقین کے ساتھ کیسے کہا جا سکتا ہے۔“ حمید نہ اسامنہ بنا کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے وہ بھی ہمارے ہی طرح غلط بھی کاشکار ہوا ہو۔ یقین کوئی نام اور عاشق جو سمجھا ہو کہ اُس کی محظوظ ہماری گاڑی میں سفر کر رہی ہے۔“

دفعہ فریدی نے اُنکن کی رفتار تیز کر دی اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں کاروں کا فاصلہ کافی طویل ہو گیا۔

”دیکھتے رہو! یعنی ہی پچھلی گاڑی کسی نشیب میں جائے فر اب تا۔“ فریدی نے کہا۔ حمید پھر مڑا۔ پچھلی گاڑی شامد نشیب ہی میں جا رہی تھی۔ کیونکہ اب اُس کے ہیئت یمپس نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

”نشیب ہی میں ہے۔“ حمید جلدی سے بولا اور فریدی نے گیئر بدلتے۔ رفتار کم ہو گئی۔ ساتھ ہی گاڑی کی روشنیاں بھی گل ہو گئیں۔

”بائیں جانب اتر جاؤ۔“ فریدی نے اُنہیں بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ حمید کو کچھ سوچنے کی مہلت نہ مل سکی۔

سوچ رہا تھا کہ اگر شہر پہنچ کر انہوں نے بھی کار اپنے پہنچ دیکھی تو ہوشیار ہو جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے نارنج روشن کر کے اُسے اچھی طرح دیکھا جاتا تھا۔

”اوہ....!“ وہ یک بیک اچھل پڑا۔ پھر کھڑکی سے تیز قسم کی روشنی کار میں داخل ہوئی تھی۔ ایں بنے مڑ کر دیکھا آنکھیں چند ہیا گئیں۔ گور و شنی کا فاصلہ زیادہ تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی تیز شعایں آنکھوں سے گزر کر گدی سے دوسری طرف نکل جائیں گی۔ اور پھر گھنٹیوں کی آوازیں جنگل کی پر سکون فضائیں ارتباش پیدا کرنے لگیں۔

”فار بر گیلڈ...!“ فریدی نے کار کی رفتار کم کر کے اُسے ایک طرف کر لیا۔ مگر پھر پورے بریک گائے اور پھر تی سے انہیں بند کر دیا۔ ”اترو....!“ اُس نے حید کو دھکایتے ہوئے کہا۔ اس بار وہ دونوں ایک دوسرے پر گرے اور بھیک اسی وقت گاڑی کا پچھلا شیشہ چور چور ہو گیا۔ بیک وقت کئی فائز ہوئے تھے۔

”چلوو...!“ فریدی نے سڑک کے نشیب میں اندر جاؤ اندھے چھلانگ لگائی۔ اس بار پھر حید اپنے بیرون کو تکلیف دیئے بغیر نیچے پہنچ گیا۔ اس کی چیخیں سکاریوں ہی میں تبدیل ہوتی رہی تھیں۔ جانے کتنے کا نئے جسم میں چھے ہوئے تھے اور نیچے پہنچ کر سر ایک بڑے پتھر سے تکرایا تھا۔ آگ بجھانے والی گاڑی گھنٹیوں کا شور بکھیرتی ہوئی سڑک پر سے گزر گئی۔ فائز یقینی طور پر اسی گاڑی سے کئے گئے تھے۔ لیکن وہ بہار کی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے محض راستہ بنانے کے لئے فائز کئے گئے تھے۔

حید نے بڑی قوت سے دانت پر دانت جما جائے۔ پتہ نہیں یہ جلاہٹ تھی یا سر کی دھکتی ہوئی چوٹ جس نے دانت بھینچے پر مجبور کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم زندہ ہی ہو گے۔“ قریب ہی فریدی کی آواز آئی۔ ”ایسے وہیات خیال پر مجھے غصہ بھی آسکتا ہے۔“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ اپنی خوش طبی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

وختا ایک زور دار دھاکہ ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اتنی روشنی ہوئی تھی کہ سارا جنگل ایک

”اتی تیتی گاڑی یہاں دیرانے میں اس طرح چھوڑ دی گئی ہے۔“ دوسری آواز آئی۔ ”وقت نہ برباد کرو... یا آگے چلو یا اپس۔“

”وہ توہا تھے سے گیا... واپسی ہی مناسب ہے۔“

وہ شاید گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی بیک ہوئی اور پھر شہر کی طرف مڑ گئی۔

جب وہ کچھ دور نکل گئی تو فریدی بھی اٹھا اور دونوں لنگن کی طرف آئے۔ تھوڑی دیر بعد“ بھی شہر کی طرف مڑ رہے تھے۔ لنگن کے ہیئت یمپس بجھے ہوئے تھے لیکن عقبی سرخ روشن اندکی ہے خطرات کے لئے جاگ رہی تھی۔

لنگن کی رفتار خاصی تیز تھی۔ حید نے اس پر اعتراض کیا کیونکہ اندھیرے میں اتنی تیز رفتاری خطرناک ہی تھی۔ لیکن فریدی نے جواب نہ دیا۔ رفتار اسی وقت کم ہوئی تھی جب آگے والی کار کی عقبی سرخ روشنی نظر آنے لگی تھی۔

”ان لوگوں کے متعلق کیا خیال ہے۔“ جید نے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔“ فریدی نے تشویش کن لمحے میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ گاڑی قلعی غیر متعلق رہی ہو جائے ہم اپنے تعاقب میں سمجھے تھے۔“

”لیکن خود اس گاڑی کا تعاقب کیا گیا تھا۔“

”بس اب یہی دیکھنا ہے کہ یہ لوگ کون ہیں۔ ان کے اندازِ نگتگو سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جس کا انہوں نے تعاقب کیا تھا وہ اتفاقاً ہی کہیں انہیں نظر آگیا تھا۔“

”تو پھر ہو سکتا ہے کہ ہمارا تعاقب کرنے والے کا بھی تعاقب کیا گیا ہو۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کار ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔ اور اگر نہیں تھی تو خدا ہمیں معاف کرے کیونکہ اس نے رات صرف آرام کے لئے بنائی ہے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ اس بھاگ دوڑ میں حید کی بھوک چک اٹھی تھی وہ تھوڑی دیر مک، کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کیوں جناب کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کار میں ہمارے ہی ٹھکنے کا کوئی آدمی رہا ہو۔“

”سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہو۔“

دونوں کاروں کے درمیانی فاصلے میں ابھی تک کوئی خاص فرق نہیں واقع ہوا تھا۔ لیکن حید

مزید بحث کا موقع نہیں تھا۔ حمید چپ چاپ اگلی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی بیک کر کے مخالف سمت میں موڑی اور خود مزکر یہ بھی نہیں دیکھا کہ فریدی وہیں کھڑا ہے یا نیچے اتر گیا ہے۔

اس نے بڑی جلاہٹ کے عالم میں اسٹریٹ گک سنھالا تھا۔ گاڑی سنان سڑک پر فرائے بھرنے لگی۔ مگر ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ تار جام کے کسی ہوٹل میں چین سے سوتوں کے گا۔ ظاہر ہے کہ اسی وقت تو واپسی ہونے سے رہی۔

تار جام کا فاصلہ اُس کے اندازے کے مطابق یہاں سے کم از کم چالیس میل ضرور رہا ہو گا۔ دکار کی رفتار تیز ہی کرتا رہا۔۔۔ لیکن اس کا ذہن اب پھر الودا رے اور مثلث میں الجھ کر رہ گیا۔۔۔ یہ کیا چکر تھا جس کیلئے اتنی ہنگامہ خیزی ہوئی تھی اور وہ لوگ کون تھے جنہوں نے کسی کا تعاقب کیا تھا اور پھر صوت کی آخوش میں جاسوئے تھے۔۔۔ پتہ نہیں اُن میں سے کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔۔۔ یک بیک اُس کے کانوں میں ایک سریلی سی آواز گوئی۔۔۔ آپ کے پاس ماجس تونہ ہو گی۔۔۔

آواز گاڑی کی بچھلی نشست سے آئی تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ اسٹریٹ گک پر کاٹپ گئے اور وہ گاڑی کو بے قابو ہونے سے بمشکل بچا سکا۔

آواز نسوانی تھی اور سوال انگریزی میں کیا گیا تھا۔ لبھے غیر ملکیوں کا ساتھ۔ لیکن وہ انگریز نہیں ہو سکتی تھی۔ حمید کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن یہی جملہ پھر دہرا یا گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر اسٹریٹ گک کو صرف دینے ہاتھ سے سنھالا اور بائیں سے ماچس نکال کر مڑے بغیر فرمائش پوری کر دی۔ وہ دنہ شیلد پر سے نظر نہیں ہٹانا چاہتا تھا۔

”شکریہ....!“ آواز آئی۔ پھر اُس نے دیا مسلمانی کے جلنے کی آواز سنی۔ غالباً سگر یہٹ ہی سلگائی گئی تھی۔

حمدید سوچ رہا تھا کاش روائی سے پہلے گاڑی کے اندر بھی ایک نظر ڈال لی ہوئی۔ مگر کیا وہ تھا ہی ہو گی۔

یک بیک اُس نے گیئر بد لے اور گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔

”یہ مناسب نہیں ہو گا جتنا۔۔۔“ نہایت شریفانہ لبھ میں کہا گیا۔ لیکن اس بار بھی آواز نسوانی ہی تھی۔

”مناسب تو یہ بھی نہ ہو گا کہ آپ میرے ساتھ اکیلی سفر کریں۔۔۔“ حمید نے پر سکون لبھ

پل کے لئے جاگ سا پڑا تھا۔ ”گئی.... ختم ہوئی وہ کار۔“ فریدی بُو بُر اتا ہوا سڑک کی طرف چھپنا۔ حمید میں اتنی سکن کھلا تھی کہ وہ بھی دیسی ہی تیزی دکھا سکتا۔ سر کی چوٹ نے اسے نthal کر دیا تھا۔

فریدی انجمن اشارت کر چکا تھا۔ لیکن حمید کا انتظار کرتا ہی تھا۔ جیسے ہی وہ بچھلی سیٹ پر پہنچا کار چل پڑی۔ آگ بچانے والی گاڑی کی گھنٹیاں اب نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

”میکا کر ہے ہیں آپ....!“ حمید بھنا کر بولا۔

”یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی زندہ بھی بچایا نہیں۔“

”کس کی بات کر رہے ہیں۔۔۔“

”اس کار کی جو کچھ دری پہلے ہماری گاڑی کے قریب رک تھی۔“

”تو یہ آگ بچانے والی گاڑی۔۔۔“

”آگ بچانے والی گاڑی کے علاوہ اور سب کچھ ہو سکتی ہے اس کی ساخت میرے لئے بالکل نئی تھی۔“

”اوہ....!“ حمید کھڑکی پر جھکتا ہوا بولا۔ ”وہ ہے شعلے... باہمیں جانب... نیچے...“

فریدی نے کار روک دی۔ باہمیں جانب نشیب میں ایک کار الٹی پڑی دھڑادھڑ جل رہی تھی۔

فریدی گاڑی سے اتر اتو۔۔۔ لیکن وہیں روک گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کار والوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا ہو۔ اُن میں سے کسی کو چیخنے تک کامو قنہ مل سکا ہو۔

”مگر یہ کیسے ہوا ہو گا۔“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مکراو... اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ یا پھر گاڑی ہی ذرا ایور کے قابو سے باہر ہو گئی ہو۔ سونو وہ گاڑی جیسی بھی رہی ہو۔ شہر کی طرف نہ جا سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس بارہہ خاموشی سے واپس آئے لہذا مناسب یہی ہے کہ تم اپنی گاڑی تار جام کی طرف نکال لے جاؤ۔ ہم پرانہوں نے صرف گولیاں چلاتی تھیں اور نظر انداز کرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔“

”میں آپ کو یہاں تھا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”جاو...!“ فریدی نے اسے کار کی طرف دھکلتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال میں گاڑی تباہ کرنے کے مود میں نہیں ہوں۔“

میں کہا۔ ”ویسے میری گاڑی پہلے بھی کئی بار لا کیاں جن جکل ہے۔“
 ”اوہ.... تب تو آپ ایک تجربہ کارڈ وائٹ بن چکے ہوں گے۔“
 ”نمہزہ بینڈ...!“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن آج تو میں خود کشی کے لئے ہوں۔ اس لئے مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ خداراللہی باتمیں نہ کچھ جنہیں سن کر بھی آئے۔“
 ”خوب! تو آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں۔“
 ”قطیعہ... کیونکہ لوکیوں سے اس سے زیادہ کی توقع رکھنا فضول ہے۔ اچھا تو آپ کس طرح مرنا پسند کریں گی۔ گاڑی کو سرزاک کے پنج گراوں یا کسی درخت سے ٹکڑا دوں۔“
 ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے ہاتھ میں پتول ہے۔“
 ”فائز کرو... اچھا ہے۔ مجھے خود ہی گاڑی نہیں گرانی پڑے گی۔“
 ”اچھی بات ہے۔ جو دل چاہے کرو۔ اس بار لمحے میں لاپرواں ظاہر ہو رہی تھی۔“
 ”تب تو میں تمہیں ہائینے کی نظم نہاؤں گا..... جسم ہونا تم...!“
 ”اوہ.... کیا ہائینے پسند ہے تمہیں۔“ لوکی نے پر اشتیاق لمحے میں پوچھا۔
 ”بہت زیادہ...!“
 ”اور... رکے...!“
 ”و تو مجھے بالکل چند معلوم ہوتا ہے۔“
 ”بکواس ہے۔ اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“
 حمید نے محوس کیا کہ وہ اُسے باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتی ہے۔ یک بیک اُس نے کار روک کر اندر کا بلب روشن کر دیا۔
 ”کیوں...؟“ لوکی کا ہمہ سہ کھل گیا۔ وہ خاصی قبول صورت تھی۔ عمر بیک اور پچھس کے درمیان رہی ہوگی۔
 ”تم نے ابھی پتول کی دھمکی دی تھی۔“ حمید سکریا۔
 ”وہ تو میں نے یو نبی...!“ لوکی پس پڑی۔
 ”میں اپنی گاڑی میں تمہاری موجودگی کی وجہ پوچھنا چاہتا ہوں۔“
 ”لفٹ.... تار جام لکھ۔ لیکن رات میں نے بڑے ڈراؤنے مناظر دیکھے ہیں۔ میراڑاں

”قاومتی نہیں ہے۔“
 ”یہاں اتنی رات گئے تمہارا کیا کام...!“
 ”میں پیدل ہوا خوری کی عادی ہوں۔ آج راستے بھول گئی۔“
 ”جہاں سے تم بیٹھی ہو گئی وہاں سے شہر میں میل کے فاصلے پر ہے اور تار جام چالیس میل دور۔ اچھا تو یہ ہوا خوری کہاں سے شروع ہوئی ہو گئی۔“
 ”نہ میں سمجھا سکتی ہوں اور نہ تم سمجھ سکو گے۔ لہذا ہمیں دوسری باتیں کرنی چاہیں۔ مثلاً صحت کی باتیں۔ اگر تھوڑی بہت سو بھج بوجھ نہ بھی رکھتے ہو تو اثر پیشہ پولیٹکس کی باتوں میں کوئی مفاہمہ نہیں۔“
 ”مضاقتہ تو اس میں بھی نہ ہو گا کہ میں تمہارا گلاں گھونٹ دوں۔“ حمید نے کار سے اترتے ہوئے کہا اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر تحکماں نہ لمحے میں بولا۔ ”یچے آؤ۔“
 ”یہ تو ناممکن ہے۔ تم خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہو۔ میں اسے قطعی پسند نہیں کروں گی کہ مجھے تھا چھوڑ کر اپنی راہ لو۔ یہی کرنا تھا تو شہر سے کیوں ساتھ لائے تھے۔“
 ”اوہ...!“ حمید نے دانت پیٹے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر اُسے نیچے کھینچ لیا۔
 ”درمنے... وحشی۔ وہ غصیلے انداز میں بسوار کر بیوی۔“ عورتوں سے ایسا ہی برداشت کرتے ہیں۔
 ”میرے ذمہ دی کے گراٹھ فادر تو چانے اڑا دیا کرتے تھے۔“ حمید نہایت اطمینان سے بولا۔ وہ پچھلی نشست کا دروازہ بند کر کے لوکی کو ایک طرف دھکیلایا۔ ہوا اگلی نشست پر جائیٹا۔ اُنہوں اشادرت کیا اور کار حرکت میں آگئی۔ لیکن لوکی ہنسنے اس سے بھی زیادہ پھر تیلے پن کا اظہارہ کیا۔ لیکن وہ کار کے آگے اس طرح دوڑ رہی تھی کہ حمید کو اُسے پیچھے چھوڑ جانے کا موقعہ ہی نہیں فرمیا۔
 ”نیسبت ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں کار کی رفتار ہی کیا رہی ہو گئی۔“
 ”میں تمہیں کچل دوں گا۔“ حمید بھجنگلا کر بیوی۔
 ”ضرور کچل دو۔“ اس نے اسی طرح دوڑتے ہوئے جواب دیا۔
 ”وہ اسے پھر تیلے پن سے گاڑی کا راستہ بار بار روک رہی تھی جیسے سر کے پچھلے حصے پر بھی دو آنکھیں رکھتی ہوں؟“
 ”ارے کیا واقعی مرنا چاہتی ہو۔“ حمید حلق چھاڑ کر دہڑا۔

تین آدمیوں کا خون اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی کار اسی طرح اچھل کر کھٹ میں جا پڑی تھی جیسے وہ کوئی کھلنا ہوا اور کسی شریر بچے نے ایک معمولی سی ٹھوکر سے اُسے دور پھینک دیا ہو۔
”وہ کون تھے۔“

”خدا جانے... ایک آگ بجھانے والی گاڑی اس سے نکرای تھی لیکن نہ تو آگ بجھانے والی گاڑی کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا اور نہ اُسے کوئی نقصان ہی پہنچا تھا میں نے ایسا حادثہ آج تک نہیں دیکھا۔“

”مگر تم ہاں کیا کر رہی تھیں۔“

”یہی سوال میں تم سے بھی کہ سکتی ہوں۔“

”لڑکی.... تم مجھے لوٹانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”اُو...“ وہ یک بیک اچھل پڑی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ”میرے خدا“ وہ سرسری ہوئی آواز میں بولی۔ ”آج اس وقت تک گیتی ہوئیں بنداؤ نام۔“ ہم کوں۔“

”اُو...!“ حمید جھلا کر بولا اور پھر یک بیک اچھل کر پچھے ہٹ آی۔ ساتھے کسی گاڑی کے ہی پیس چک رہے تھے۔ اس نے جیب سے روپور نکالا اور اس کا رخ لڑکی کی طرف کے ہی پیس چک میں اترتا چلا گیا۔ سر کی تکلیف بدستور موجود تھی۔ اسی نے ذہن کو کسی قابل نہیں

ہوئے نشیب میں اترتا چلا گیا۔ رخ کی تکلیف بدستور موجود تھی۔ اسی نے ذہن کو کام کر چکا ہوتا۔ رکھا تھا درد و انتہے احتمانہ انداز میں وقت برہاد کر لئی۔ بجائے اب تک کوئی ڈھنگ کا کام کر چکا ہوتا۔

”ارے... ارے...!“ لڑکی کی آواز سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ ھوڑی ہی دور چل کر حمید کو ایک اسی جگہ مل گئی جہاں چھپ کر وہ صرف اپنی حفاظت کر سکتا تھا بلکہ سڑک پر بھی نظر کر کے

سکتا تھا۔ یہ پھر دوں کے کچھ ڈھیر تھے جن کے رخنوں سے لمبی لمبی گھاس اُگ آئی تھی۔ آنے والی کار لٹکن کے قریب ہی رکی اور کسی نئے انگریزی میں پوچھا۔ ”کیا ہو۔“

”اوہر نکل گیا۔“ حمید نے لڑکی کی آواز سنی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ لیکن حمید کی چھٹی جس کہہ رہی تھی جیسے وہ آخر تھے آہستہ گفتگو کر رہے ہوں۔ اچاک لڑکی چیختے گئی۔ ”ارے... ارے... تو مجھے مارتے کیوں ہو۔ کیوں مارتے ہو۔“

”تم نے اُسے نکل کیوں جانے دیا۔“ کسی مرد نے کہا۔

”ارے... وہ اکو تھا... اکو...!“ لڑکی روشنی کی آواز میں چھینی۔

وہ جواب دیئے بغیر دوڑتی رہی۔ حمید کو خطرہ سر پر منت لاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا کیون نہ فی الحال کسی کچھ راستے پر مڑ جائے یا شہر ہی کی طرف واپس چلے۔ اس طرف آنکھیں مقصد گاڑی کی حفاظت تھا۔ ہو سکتا ہے کہ فریدی کا یہ خیال کہ وہ خطرناک گاڑی پھر واپس آئے گی صرف ایک لا یعنی سا انکریشہ رہا ہو۔ مگر یہ لڑکی وہاں کیسے رہ گئی تھی۔ یہ اسی گاڑی سے اترنے ہو گئی جس پر آگ بجھانے والی گاڑیوں کی سی گھنٹیاں نج رہی تھیں۔

یک بیک اس نے رفتار بہت کم کر دی۔ مگر لڑکی اپنی پہلی ہی سی رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ رفتار کم کر کے حمید نے بریک لگائے اور پھر گاڑی کو بیک کر کے شہر کی طرف موڑنے شروع کر دیا تھا کہ لڑکی پلٹ پڑی اور رہا تھا ہلا کر زور سے بولی۔ ”احمق نہ ہو۔ موت کے منہ میں نہ جاؤ۔“

حمدید نے دیکھا کہ اب وہ پھر دوڑتی ہوئی اس کی طرف آرہی ہے۔ اس نے ہیڈ لیپس بجا دیئے۔ تیری سے دروازہ کھولنا اور باہر آگیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ گاڑی کے پیچے تھا۔ ارادہ تھا کہ اب وہ اس کے ہاتھ پر باندھ کر گاڑی میں ڈالے گا اور تار جام کی بجائے شہر ہی کا رخ کرے گا اور نہ ہو سکتا تھا کہ آگے چل کر اسے کسی جاں میں پھنسنا پڑتا۔ کیونکہ وہ اسے تار جام ہی کی طرف لے جانا چاہتی تھی۔

لڑکی بھی احمق نہیں معلوم ہوتی تھی اس نے حمید تک پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کے اندر ردو شنی کر دی۔ پھر بولی۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ اب تم جھگڑا کرنا چاہتے ہوں اچھا تو آؤ... میں تم سے کمزور نہیں پڑوں گی۔“

حمدید پھر دانت پیش کر رہا گیا۔ ”خود بھی تھک رہے ہو اور مجھے بھی تھک کر رہے ہو۔“ لڑکی پس پڑی۔ ”تم آخر جاہتی کیا ہو۔“

”آہ... یہ نہ پوچھو۔“ وہ ٹھنڈی سانس ملا لے کر بولی۔ ”جب سے تمہیں دیکھا ہے میرا ذہن قابو میں نہیں ہے۔“

”ذہن کو قابو میں رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گاڑی کے سامنے لیٹ جاؤ۔“ حمید اور پری ہوش ٹھیک کر بولा۔

”سنو...!“ لڑکی سنی ان سنی کر کے بونی۔ ”یہ رات بڑی بھیاںک ہے۔ ابھی ابھی میں نے

کاغذ کے ٹکڑے پر پہل سے ایک طرف اور تحریر تھا اور دوسری طرف ایک دائیہ تھا اور ایک مثلث۔ یہ بھی پہلی سے بنائے گئے تھے۔

”یہ کیا حماقتوں شروع ہو گئی ہیں۔“ حمید بڑا بولایا۔

”سوال یہ ہے کہ وہ لڑکی وہاں کیا کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ہمارے پیشے سے پہلے ہی وہاں موجود ہو گی۔ تبھی تو گاڑی میں داخل ہو سکی تھی۔“

”یقیناً اس نے باقاعدہ طور پر اُس کاڑ کی تباہی کی داستان سنائی تھی۔ بس آنکھوں دیکھا حال سمجھ لیجئے۔“

”جو بھی ہوں! پرے سرے کے گدھے معلوم ہوتے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں....؟“

”کچھ نہیں! تم خود سوچو جو لوگ تم چیزے اُو سے خائف ہو جائیں پھر اور کیا کہا جائے گا۔“

”ہوں...!“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔ ”میری چھٹی کی درخواست اب منظور ہی ہونی چاہئے۔“

”ضرور ہو گی۔“ فریدی نے بھاہو اس گاریش ٹرے سے اٹھا کر سلاٹے ہوئے کہا۔

”حید چند لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتا ہا پھر بولا۔“ آپ گھر تک کس طرح پہنچے تھے۔“

”تین چار میل پہلے چلنے کے بعد اتفاقاً ایک ٹرک مل گیا ورنہ صحیح ہو جاتی۔“

”جادی کی اطلاع آپ ہی نے دی ہو گی۔“

”نہیں! اس ٹرک کاڑ ایمور بھی جلتی ہوئی کار دیکھتا اور ہر ہی سے گذر اتھا۔ اس بحث میں نہ چڑو۔ حکام کو بہر حال اس حادثے کی خبر ہو چکی ہے۔ لیکن تم اپنی زبان بند رکھو گے۔“

”زبان میں لگام دینا محاورہ ہے۔“ حمید خواہ مخواہ بڑا بولایا۔ ”پھر بولا۔“ آج فتنہ میں کیا رہی۔“

”کاغذات اور فاسکیلوں کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔“

”اُک اور جیو میٹری زیادہ زیر بحث رہے ہوں گے۔“

”میں نے اس مسئلے پر کسی کو گفتگو کا موقعہ ہی نہیں دیا۔“

”آپ خود کسی نتیجے پر پہنچے ہیں یا نہیں۔“

”ابھی نہیں۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

”چھلے چوبیں گھنٹوں میں پے در پے کتنے حادثے ہوئے ہیں۔ ذا کٹرڈاؤڈ کے بعد جسمہ ساز نصیری

”کیا... اُو... نہیں۔“ حمید نے محضوں کیا کہ مرد کی آواز سے بھی خوف ظاہر ہونے لگا ہے۔ ”ہاں... ہاں اکو تھا...!“

”چلو... بھاگو جلدی...!“ یہ کسی دوسرے مرد کی آواز تھی۔

”پھر کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے وہ ایک دوسرے پر گرنے پر رہے ہوں۔ کار پھر اسی طرف مرتقی دکھائی دی جو حضرتے آئی تھی۔“

”اُکو...!“ حمید آہستہ سے بڑا بولایا اور دکھتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

انقیاز کی تمنغہ

کرنل فریدی نے سگاریش ٹرے میں رکھتے ہوئے مسلک اکر کہا۔ ”تو وہ لڑکی تمہیں اکو سمجھ بکھارنے ہو گئی تھی۔“

”ہاں ہو سکتا ہے جو منی میں ہلز جیسے آدمی اکو سمجھے جاتے ہوں۔“ حمید برا سمانتہ بنا کر بولا۔ ”اوہ.....! تمہیں اس پر بھی یقین ہے کہ وہ جو من ہی تھی۔“

”یہ اندازہ ہے۔“

”بہر حال اُر نے انہیں خائف کر دیا تھا۔ ہاں تم نے رات کہاں گزاری۔“

”تاریخ کے علاوہ اور کہاں گزارا تا۔ واپسی تو آپ کے قول کے مطابق موت کے جڑوں ہی میں لے جاتی۔“

”بھجھو ہم ہوا تھا۔“ فریدی مسلک اکیا۔ ”میں سمجھا تھا کہ شاکرہ گاڑی پھر واپس آئے گی۔“

”آپ وہیں رک رہے تھے۔“

”ہاں لیکن وہ گاڑی واپس نہیں آئی تھی۔ کار نے حادثے میں ختم ہونے والوں میں سے صرف ایک کی شکل قابل شاختہ رہ گئی تھی۔ وہ آدمیوں کے پھرے جل کر سمجھ ہو چکے تھے۔“

”قابل شاختہ لاش کی جیب سے صرف یہ چیز برآمد ہوئی تھی۔“

”فریدی نے کاغذ کا ایک ٹکڑا حید کی طرف بڑھا دیا۔“

”صرف.... یہ....!“ حمید نے مسخرانہ اندازہ میں کہا۔

نہیں جانتے راجہ بکر براجیت کے زمانے میں ایک گلہری کسی بھی سے پر عاشق ہو کر روزانہ ساڑھے
تمنا سبز دودھ دینے لگی تھی۔

”سالے مجاخ اڑاتے ہو۔“ قاسم بگوگیا تھا۔

لیکن حید نے کسی نہ کسی طرح اُسے یقین دیا تھا کہ وہ بھی عاشق ہو جانے کی چیز ہے۔
بہر حال اس تو قع پر کہ وہ بھی نہ بھی اپنا پتہ بھی لکھا ہی دے گی قاسم حید سے عشقی خطوط لکھنے کی
رہیں گے لیے تھا۔

بچھے دنوں حید نے اس کا ایک محبت نامہ پار کر کے لفافے میں بند کیا اور اس پر اس کے
بپ کا پتہ ناپ کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اس طرح کہ قاسم کو اس کی ہوا بھی نہ لکنے پائی۔

آج وہ اسی لئے قاسم کے گھر جانا چاہتا تھا کہ اپنی اس شرارت کے انجام سے لطف انداز
ہو سکے۔ فرضت کے اوقات میں قاسم سے الجھنا اس کا محبوب ترین مشغله تھا۔

اس نے گیر اچ سے کار نکالی اور دل میں اپنی شرارت کے متوقع نتائج پر بنتا ہوا کمپا ڈندا
ہے سڑک پر نکل آیا۔ شام خاصی خشکوار تھی اس لئے اُسے تو قع نہیں تھی کہ واپسی جلد ہو سکے
پھر خیال آیا کہ اگر شرارت واقعی کامیاب رہی ہوگی تو اس وقت قاسم کے یہاں چائے ملنے کا سوال
عن زیداد ہو سکے گا۔ اس لئے اس نے رہا میں ایک جگہ گاڑی روکی۔ اتر کر ایک صاف سحرے کیفے
میں آیا۔ گھر پر چائے بھی نہیں پی تھی۔ محض اس خیال سے کہ کہیں چائے کے دودان کوئی ایسی
افادہ پڑے کہ گھر سے نکلا ہی نہ ہو سکے۔ یا کسی سلسلے میں دوڑھوپ ہی کرنی پڑ جائے۔

کیفے کی فضا پر سکون تھی۔ بہشکل تمام دو تین میزیں آباد رہتی ہوں گی۔ حید نے چائے
طلب کی اور پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

ان دنوں اس کی ذاتی حالت عجیب تھی۔ نہ کسی کام میں دل لگاتا تھا اور نہ تفریحات میں۔
خصوصیت سے ہو ٹلوں اور ناٹ کلبوں کی تفریحات تو اس کے لئے بالکل بے جان ہو کر رہ گئی
تھیں۔ دوست لڑکیوں کے تصور سے دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اُسے وہ اس نئے طالب علم کی
حالت سے تنبیہہ دیتا تھا جسے استاد نے کسی بات پر خفا ہو کر مر غایب دیا ہو۔

البتہ قاسم کی بات دوسرا تھی۔ اس کے ساتھ تو کافی ہنسنا ہنسنا ہو جاتا تھا۔ بھی وجہ تھی کہ
آن کل اس کی دوڑھ عموماً قاسم ہی کے گھر تک ہوا کرتی تھی۔

کا قتل پھر ایک کار کی تباہی جس میں تین آدمی ہیمند کے لئے ہو گئے۔

”نصیری پر آپ کی نظر کس سلسلے میں تھی۔“

”ایک غیر ملکی سفارت خانہ اُس کے مجھے غیر ضروری طور پر فرید تا ہے۔“

”ہوں! اچھا لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس معاملہ کا تعلق بھی اُسی ملک سے ہو۔“

”میں یہ کب کہتا ہوں۔ کسی آدمی کی زندگی کے ایک پہلو پر نظر ڈالنے سے بعض دوسرے
پہلو خود بخود سامنے آ جاتے ہیں۔“

”نصیری کے خلاف آپ کیا چارج لگاتے۔“

”اگر کبھی کچھ ثابت کر سکا ہوتا تو تب تیرے چارج لگ جاتے۔“ فریدی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

”ختم کرو۔ میں اس کیس میں بہر حال دلچسپی لے رہا ہوں۔“ پہاڑ

”آپ جائیں... مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہمیں کسی بہت بڑی تو قیم کا سامانہ کرنا پڑے۔“

”تم اس کی فلم رہ کرو۔“

”اب فکر بھی نہ کروں! بالکل ہی کاہل ہو جاؤں۔“ حید نے آنکھیں نکال کر کہا اور فریدی
مکرا پڑا۔

”ضرور کرو... لیکن یہاں نہیں۔ کیا تمہیں کہیں باہر جانا ہے۔“

”اگر جاسکوں تو۔“

”ضرور جاؤ... ورنہ کسی دفашعار بیوی کی طرح دماغ چاٹتے رہو گے۔“

جانا کہاں تھا؟ صرف قاسم کے گھر تک کیونکہ آج کلن وہ اُسے عشقی خطوط لکھنے کی مشق
گراہ تھا اور آج تو اسی سلسلے میں اپنی ایک شرارت کا رد عمل بھی دیکھنا تھا۔

کچھ دنوں پہلے اس نے قاسم کو پے در پے کئی عشقی خطوط لکھتے تھے۔ کسی گلنم لڑکی کی جانب
سے، جن میں ظاہر کیا تھا کہ وہ قاسم کے اوپر مر منی ہے لیکن ابھی اپنے متعلق کچھ نہیں بتتا
چاہتی۔ ایک نہ ایک دن اس سے اس طرح ملے گی کہ وہ متاخرہ جائے گا۔

قاسم نے دو خطوط کسی نہ کسی طرح ہضم کر لئے لیکن تیرے خط پر حید ہی کے پاس دوڑا
آیا۔ اسے کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی لڑکی اس طرح خواہ مخواہ اُس پر عاشق بھی ہو سکتی
ہے۔ اس پر حید بڑی دیر تک اس کے حل میں فلفہ عشق ٹھونٹ رہا تھا اور پھر بولا تھا اسے تم

132

”رہنمائی کا پچھر پین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔“
”میا ہو اور سرے نے پوچھا۔“
”میں کہتا ہوں۔ اگر ملکت اور دائرے کی کوئی اہمیت ہے تو آؤ کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔“
”میں پوچھ رہا ہوں... فون پر کون تھا۔“
”باس...!“
”اچھا تو پھر؟ کیا تم نے الوکا حوالہ دیا تھا۔“
”ہاں! لیکن وہ کہتے ہیں کہ الوکی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔“
”سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ ہر معاملے میں اپنی ناگف کیوں اڑا دیتا ہے۔ بھلاڑا کثر داؤ کے
قتل سے یا قتل کی پشت پر جو حالات ہوں ان سے اس کا یہ متعلق...!“
”اس بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ نہیں تو صرف اتنا ہی کرتا ہے جتنا ہم سے کہا جائے۔“
”ہاں... آس...!“ تیرے نے انگرائی لی۔ وہاں بھی تک پکھے ہمیں نہ بولا تھا۔ انگرائی لے کر
اس نے میز پر طبلہ بجانا شروع کر دیا۔
”نیک ہے“ دوسرا بولا۔ ”بگر کیا تھا رے دل میں خواہش سے بیدا ہو گی کہ تمذا کثر داؤ کے
قتل کے متعلق بھی کچھ معلوم کرو۔ کس نے قتل کیا تھا؟ کیوں کیا تھا؟ اس کے بعد کہیں الوکت
اور دائرے پر غور کرنے کا سوال پیدا ہو گا۔“
”ارے یا ز جھوڑا! اس وقت اس نے کیا کہا ہے۔“ تیرے نے ہاتھ روک کر پوچھا۔
”یہی کہ ذا کثر کے لئے جلنے والوں سے ملکت اور دائرے کا تذکرہ کرتے پھر وہ ہو سکتا ہے
ان میں سے کوئی ان کے متعلق کچھ بتاسکے۔ لیکن الوکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آ
لوک کیوں اہمیت نہیں دی جاوی۔“
”اکو کو اکو ہی اہمیت وے سکتے ہیں۔“ تیرے نے کہا اور پھر میز پر طبلہ بجانے لگا۔
”اکو اور دائرے وغیرہ کی کہانی سارے شہر میں پھیل گئی ہے۔“
”پھیل جانے دو۔“ میز پر طبلہ بجائیے والے نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”مجھے تو باس کے
اور کسی کی فکر نہیں رہتی۔“
”باس کی فکر...!“

132

چائے ختم کر کے وہ باہر آیا۔ لیکن اُسے حیرت ہوئی جب اُس نے اپنی کار کے گرد لوگوں کا گام غیر دیکھا۔

اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔

”کیا بات ہے۔“ اُس نے دو آدمیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر راستہ بناتے ہوئے پوچھا۔ ”اگو....!“ قہقہوں کے ساتھ جواب ملا اور اس کی کھوپڑی تباچ کر رہ گئی۔ دل چاہا کہ دونوں سر نکل رادے۔ لیکن پھر طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا۔

”پڑھ نہیں کس شوقین کی کار ہے۔“ کسی نے کہا۔ اور جب حمید کسی نہ کسی طرح قریب پہنچا تو اس کی آنکھیں حیرت سے چھیل گئیں۔ چاروں طرف کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر ایک بڑا سالو پر پھٹپھٹانا کر ادھر ادھر نکلا۔ پھر رہا تھا۔

”ہری ہری سو جھتی ہے یار لوگوں کو۔“ مجھ میں کسی نے کہا۔ ”چلو.... چلو.... بھیڑ ہٹاؤ۔“ حمید جھلا کر بولا۔ ”ہٹو.... اے کاشمیل.... ادھر سے بھیڑ ہٹاؤ۔“ اس نے ڈیوٹی کا نشیل کو مخاطب کیا۔ جو خود بھی ایک بتاشانی کی حیثیت سے موجود تھا۔ ذرا ہی کی دیر میں بھیڑ صاف ہو گئی۔

پہلے تو حمید نے سوچا کہ کھڑکیاں کھول کر اُسے اڑا دے۔ لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ مناسب بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنی گاڑی جوں کی توں اگو سمیت وہیں کھڑی رہنے دے اور خود یعنی میں گھر واپس جائے۔ ہو سکتا ہے کہ فریدی اس کی گاڑی اُسی حال میں دیکھنا پسند کرتا۔

نیا گرہ ہوٹل کے بڑے رہائشی کمرے میں تین آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے ملبوسات اعلیٰ درجہ کے تھے۔ لیکن ان کی آنکھیں شریف آدمیوں کی سی ہرگز نہیں تھیں اور حرکات و سکنات سے بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں ذرا برادر بھی انسانیت پاپی جاتی ہو۔ تاش کے پتے اس طرح میز پر پتختے تھے جیسے اس کی ضرب سے میز کے نکڑے ہی اڑاویں گے۔ دفعتاً فون کی گھٹتی بھی اور ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر زیبور ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی گفتگو سننا رہا۔ پھر بُرا سامنہ بنا کر زیبور کریڈل میں پتختا ہوا بولا۔ ”یہ دائرے

”میں بھی کچھ کام ہی کی پائیں کر رہا تھا۔ بھائی کو خواہ خصہ آگیا۔“
 ”بیٹھو... لے... بیٹھو بھی یہ“ دوسرے نے پہلے کو زبردستی بھاتے ہوئے کہا۔ ”تھیں
 اتنی بہت جلد خصہ آ جاتا ہے اپنا بھی کیا۔“
 ”تم دونوں کو ملازمت کس نے دلائی تھی۔“
 ”تم نے... بھی...!“ دوسرے نے کہا۔
 ”اور مجھیں اس لئے کہ میں تم پر اعتماد کرتا تھا اور تم مجھ پر...!“
 ”ہاں ہاں! اس سے کس کو انکار ہے۔“
 ”میں تم یقین کرو گے کہ تمہاری کوئی لغزش مجھے موت کے منہ میں لے جائے گی۔“
 ”وہ کیسے...!“
 ”تم سمجھوں کا پار بجھ پر ہے۔ ساری ذمہ داری میری ہے۔ اگر تم سے کوئی لغزش ہوئی تو وہ
 مجھے کوئی بارے گا... سمجھے۔“
 ”ہونہے... یہ بھی ایک بھی راتیا“ میز پر طبلہ بجانے والا بے اختیاری سے سکر لایا۔
 ”میں ایام تجھ بھی میری زندگی کے کامب بخوگے۔“
 ”کیا تم سمجھ دیجئے ہو؟“ دوسرے نے پوچھا۔
 ”اُنے پھر کی لیکر سمجھوں میں غلط نہیں کہا رہا۔“
 ”دیکھو یارے۔“ وہ پھر مضطرب بانہ انداز میں میز پر طبلہ بجا کر بولا۔ ”یہ آدمی جسے ہم صرف
 باس کے ہام سے یاد کر سکتے ہیں میرے لئے ایک مستقبل ذہنی خلشہ بن کر رہا گیا ہے۔ کیوں نہ میں
 اس کا صفائیاً!“
 ”خاموشی...!“ پہلے نے خوبزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”بہت آگے نہ ہو۔“
 خاموشی رہو۔ اگر تم وہی طور پر استئنے ہی الجھے بچکے ہو تو کسی گوئی پیش چھپ کر آرام کرو۔ اس
 ملازمت سے پچھا جھڑانا چاہیے ہو تو میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔ لیکن کسی قسم کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو
 تم میری موجودگی میں نہیں کر سکتے۔“
 ”انتے خائف ہو۔“ تھیرے نے آنکھیں بچڑا کر کہا۔ ”تم یعنی... جیری دی گریشہ۔“
 ”میرا پانام پیداں الگ ہے۔ وہاں میں کسی سے بھی بچھے نہیں ہٹ سکتا۔ سمجھے۔ لیکن اس

”ہاں... وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ اُس کی اصل صورت کیسی ہے۔“
 ”اصل صورت...؟“ پہلے کا لجر تحریک تھا۔
 ”اوہو... کیا تم کچھ ہو کہ وہ جس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے وہ اس کی اصل شکل
 ہے۔ آنکھوں پر بڑی ہی تاریک ٹیکشیوں والی یونک چڑھائے رہتا ہے اور گھنی موچیں قلبی طور
 نعلیٰ ہیں۔“
 ”بکواس ہے۔“ پہلا بولا۔
 ”مت یقین کرو“ تھیرے نے لاپرواں سے شانوں کو جیش دی اور پھر میز پر طبلہ بجانے لگا۔
 تاش کی گذی ایک طرف رکھ دی گئی تھی اور ان میں سے اب کوئی بھی کھلنے کے موڈ میں
 نہیں معلوم ہوتا تھا۔
 ”سوال یہ ہے۔“ پہلا آدمی تھوڑی دری بعد بولا۔ ”کیا ڈاکٹر داؤد کی ذہنی حالت اُس وقت
 تھیک تھی جب اُس نے اپنے ہی خون سے مثلث اور دائرة بنایا تھا۔“
 ”اگر ذہنی حالت تھیک نہیں تھی تو اپنا ہاں بھی پاگل ہی معلوم ہوتا ہے۔“ تیرما تمہر روک کر
 بولا۔ پھر پہنچنے لگا۔ دونوں نے ٹھیکی کی وجہ پوچھی تو بولا۔ ”یہ سب سے بڑا سوال ہے کہ میں فریدی کا
 پھر وہ سب اس طرح خاموش ہو گئے چیزے دفاتر وہ میں قبض کر لی گئی ہوں۔
 ”تحوڑی دری بعد پہلے نے کہا۔ ”ہم نے ابھی تک کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کیا۔“
 ”واہ...!“ تیرما تھا ہلا کر بولا۔ ”اکو مثلث اور دائرة کی فکر کے ہوئی چاہئے۔ ہمیں
 کریں فریدی کو! اور یہ کیا کہہ رہی ہے، ہو کہ ہم نے ابھی تک غیر قانونی کام نہیں کیا۔“
 ”فشوں باعثیں مت کرف۔“ پہلا چھلا گیا۔
 ”ہاں میں... مجھے آنکھیں دکھاتے ہو... تم...!“
 ”ہاں... میں تمہارا انچارج ہوں۔“
 ”اے... چوکر کے پیشکار صاحب۔ کیا تم مجھے جانتے ہیں۔“
 ”خاموش رہو...!“ پہلا مٹھیاں بھیج کر کھرا ہو گیا۔
 ”اے... اے...!“ دوسرادنوں کے درمیان آتا ہوا بولا۔ ”پاگل ہو گئے ہو۔ اگر اس
 کا علم ہو گیا تو...!“

پنج جائیں۔
وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ جیری نے آگے بڑھ کر دروازے کو بولٹ لیا اور پھر میز کی طرف بلوٹ آیا۔

دوسری آدمی کہہ رہا تھا۔ ”لو بھی... کیا کایا لپٹ ہوئی ہے۔“
لیکن دفعہ جیری کے حلق سے ایک گھٹی ہی خچ نکل۔ کیونکہ تمغہ حاصل کرنے والا کھڑے کھڑے زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

”دیکھا تمنے دیکھا۔“ جیری کا پانچا ہوا بولا۔ ”یہ زندہ نہیں ہے... دیکھا... تم نے...“
پھر وہ اس طرح گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا جیسے پیروں کی قوت جواب دے گئی ہو۔

جال

فریدی حید کو بیر ونی برآمدے ہی میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ اُس کی بدحواسی پر وہ چوک ڈالا تھا۔
”کیوں کیا ہوا... تمہاری گاڑی کہاں ہے۔“

”الو...“
”کیا کبواس ہے۔“
حید نے پوری داستان ایک ہی سانس میں دہرانے کی کوشش کی۔ فریدی بڑی سمجھدی کی سے سن رہا تھا۔

”اور دوسری بات۔“ حید سانس لینے کے لئے رک کر بولا۔ ”اُس کے پنج سے لوہے کا ایک دائرہ بندھا ہوا ہے اور دوسرے سے مغلث۔“
”خوب...!“ فریدی مسکرا یا۔ ”الو... دائرہ اور مغلث سمجھی موجود ہیں۔ اگر تم اُلو کو پالنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ چوہیا اور بکرے پر تو بتیرے تحریک کر جائے ہو۔ اس بار اُلو ہی۔ حالانکہ میں نے سنا ہے کہ اُلو کو پالنا آسان کام نہیں ہے۔“

”آپ میرا منحکمہ ازار ہے ہیں۔ تو میں خواہ کھو دوڑ آیا تھا۔“
”قطعاً! اگر اُلو کی بجائے تمہیں اپنی گاڑی میں نائم بم نظر آیا ہو تو دوسری بات تھی۔ میں بھی

آدمی کا مقابلہ تم کیسے کرو گے جس کا پیار بھی موت کا باعث بن سکتا ہو۔“
”کیا مطلب...!“ میں نے ایک بار ایک ایسے آدمی کو مرتے دیکھا ہے جس سے وہ بڑی سہرا میانی سے پیش آیا تھا۔

”کیا بات ہوئی۔“ تیرا ہنس پڑا۔

”تم نہیں سمجھ سکتے۔“ پہلا جھنجھلا گیا۔ ”تم نے باس کو قریب سے نہیں دیکھا۔“

”اب دیکھوں گا تو دبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔“ طبلہ بجانے والے نے ہنس کر کہا۔

”جاوی...!“ پہلا آدمی دہاز۔ ”فوراً چل جاؤ یہاں ہے۔ اٹھو! جب تک تمہاری ذہنی حالت اعتدال پر شا جائے میرے سامنے مت آتا۔“

”نہیں...!“ دفعہ دروازے کی طرف سے آواز آئی اور وہ اچھل پڑے۔ ایک طویل قامت آدمی دروازہ بند کر کے پنجھی چڑھا رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے ان کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی اور موچھیں اتنی گھنی تھیں کہ دونوں ہونٹ چھپ کر رہے گئے تھے۔ تینوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔

”تمہارا ساتھی دلچسپ ہے جیری۔“ آنے والے کے لجھے میں تمخض ہوا۔ ”میں ایسے دلیر آدمیوں کو پسند کرتا ہوں۔ اب تم دونوں اسی کے چارج میں رہو گے۔ جیری کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے۔“

”نہیں باس...!“ جیری تھوک لگن کر بولایا۔ ”میں اس کے سینے پر تمنہ امتیاز اپنے ہاتھوں سے لگاؤں گا۔“ اُس نے کہا اور جیب سے ایک چمکدار تمنہ نکالا جو سرخ فیٹی سے لیکر رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور میز پر طبلہ بجانے والے کے سینے پر اسے پن کرنے لگا۔ ”س... س۔“ اُس کے منہ سے بلکل سی آواز نکلی اور آنے والا جلدی سے بولوا۔ ”اوہ... پن چھپ گئی کیا! معاف کرنا۔“

تمخض لگا کر وہ پیچھے ہٹ آیا اور جیری کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اب یہ تمہارا انچارج ہے جیری! خیال رکھنا اور تم سب اُس وقت تک اس کمرے میں شہروں کے چب تک کہ دوسرے احکامات نہ

”اچھا بیٹا! سلہما کے کہتے ہیں۔“ قاسم نے لیکپ کر پوچھا۔

”ہاں یہاں ضرور غلطی ہو گئی تھی۔ وہ اصل ہلکھلا کھووانا چاہیے تھا۔“

”شیخی کھووانا چاہیے تھا۔ میں کہتا ہوں تم نے پیرے باب کو دو خط کیوں بھیج دیا۔“

”باب کو... وہ خط... کیا کہہ رہے ہیں؟“ حمید نے حرمت ظاہر کی۔ ”اُن فوڑ تو کیا البا

کوئی خط تمہارے باب کے پاس بھی پہنچا جائے میں سمجھ گیا۔“

”تیا سمجھ گے۔“

”اگلے... یہ یقیناً تمہاری کسی سالی کی حرکت ہے۔“

”میں تم سالی کی حرکت ہے... اللہ قریب مر جاؤ۔“

”مگر یہری یہی حرکت ہو تو اللہ کرے ضرور مر جاؤ... ہاں۔“

”میا قصہ ہے۔“ فریدی نے پھر وہ خل دیا۔

قاسم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھو لای تھا کہ کوئی چاہنک سے گذر کر نہ کس کپاٹوں میں داخل ہوا اور کتنے بھوکنے لگے۔ شامدر کھوائی کا اپکی لشکریں کھلا ہوا تھا۔ وہ غرا کر جھپٹا۔

”کوئے چاہا۔“ جی کسی عورت کی تھی۔

”میری... میری۔“ فریدی نے کہتے کہ آواز وہی اور خود بھی آگے پڑھا۔

”اے چاہا۔“ قاسم حمید کے شانست پر تھا بار کر پوکھلانے ہوئے لپچے میں بولا۔ لیکن حمید چاہا تھا وہی کھڑا رہ پکھا دیر بعد جب وہ روشنی کی حد میں داخل ہوئے تو حمید کو فریدی کے ساتھ اپکی بر قسم پوشی عروت نظر آئی۔

”حمد چاکر اپنی گاڑی دیکھو۔“ فریدی نے حمید کو خاطب کیا۔ عورت کا چہرہ نقاپ میں جھپٹا ہوا۔

”تم اور وہ حمید کے قریب ہی سے گذرتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔“ فریدی اس کے ساتھ تھا۔

قاسم نے حمید کی طرف دیکھ کر متینہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور آہستہ سے بولا۔ ”اے

وہ تو پچاکر اندر لے گئے۔“

حمد پکھنے دیا۔ فریدی پر تاؤ کھانے کا تینی وقت تھا۔

”بوجے پارسا بننے ہیں۔“ قاسم بڑا لیا۔ ”کیا بنے کھلا جان تھیں۔“

”مت کو اس کرو۔“ حمید جھنجلا گیا۔

دوڑا چاتا تھا بے ساتھ... لیکن اُو... حمید تم بالکل انہوں“

”اچھی بات ہے۔ اب میں بھی دیکھوں گا۔“

”اوہ... ذرا کھوپڑی استعمال کرو۔ بھلا کار میں الوچہوں نے کامیاب مقصد ہو سکتا...!“

”ایک لالجی سی بات ازیادہ سے زیادہ ہے ہو سکتا ہے کہ ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کیلئے ایسا کیا گیا ہو۔“

حمید پکھ کہتے ہی والا تھا کہ ایک دوسرا گاڑی کپاٹ میں داخل ہوئی۔ اس پر سے اترنے والے

قاسم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ چند لمحے گاڑی کے قریب کھڑا حمید کو گھورتا پڑھ بولا۔ ”میں آج تمہاری اور اپنی جان ایق کر دوں گا۔“

”یہ کیوں آیا ہے۔“ فریدی بڑا لیا۔

”دیکھئے جناب۔“ قاسم آگے بڑھ کر بولا۔ ”میں پاٹل ہو چاہرہ ہوں۔“

”ڈاکٹر کو فون کروں۔“ حمید اندر جانے کے لئے مڑا۔ مگر قاسم نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ

پکڑ لیا۔

”ڈاکٹر کی اپنی کی تھیں۔“ وہ اپنے کھا جانے والی نظر وہن سے گھورتا ہوا بولا۔ ”وہ خط ابا جان کے پاس قبیلے پہنچا تھا۔“

”کیسا خط...!“ حمید بھی آنکھیں نکال کر بولا۔ ”ارے دفع ہو جاؤ۔ میں اس وقت کوئی دوسرا اذیت نہیں لکھوا سکتا۔ جتنے لکھوا دیے ہیں انہیں زبانی یاد کرو۔“

”اے... اے سید گی طرح باتی کرد۔ تم نے وہ خط ابا جان کو بھیجا تھا۔“

”کون ساختے“

”کون ساختے اپنے وہی جس میں لکھوا تھا... نور چشمی جان پرہار سلہما السلام علیکم اور قون سا۔“

”نور چشمی جان پرہار سلہما۔“ فریدی اپنی پڑا۔

”ہے ناہی تو فی کی ہات۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”قوں حمید صاحب۔ جب میں نے کہا کہ

نور چشمی قیوں لکھواتے ہو تو پھر ملائی تھا مگنی ہے جو شہر کاٹی ہو۔ میں نے کہا تھا نہیں یہ تو لا کی کو

لکھتے ہیں۔“

”اے تو کیا تم کسی بولا ہیا کو لکھ رہے تھے۔“ حمید نے غصے لمحے میں پوچھا۔

لجلجی کی چیز حمید کی پیشانی پر
بیال ہاتھ سر سے اوپنچا کر کے بچپلی سیٹ کی طرف بڑھا دیا۔ دفتار کوئی بھی کی پیشانی پر
لگ کر پہنچی اور اس کی آنکھوں میں بڑی شدید قسم کی جلن ہونے لگی۔
”اے.... یہ.... یہ....!“ اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کچھ کہنا چاہا۔ مت کھلا اور ایسا۔
خوس ہوا جیسے حلق میں مرچوں کی دھافنس سما گئی ہو اور پھر اُس کا سارا وجود دھنی مرچوں کی
دھافنس بن کر رہا گیا۔ جلن۔۔۔ جشن۔۔۔ آگ۔۔۔
پھر اُسے ہوش ہی نہ رہا کہ کچھ یاد رکھ سکتا۔۔۔



مردوں سے شرط باندھ کر سونے والی بیویوں تھیں تو تھی نہیں کہ میدانِ حرثتی میں ہوش آتا۔
ہوش آیا اور اس طرح آیا جیسے سوتے سوتے جاگا ہو۔ نہ تو ذہن پر کسی قسم کا بارہتا اور نہ آنکھوں
کے سامنے دھنڈا ہبھت ہی تھی۔ تازگی کا یہ عالم تھا جیسے جی بھر کے سویا ہو۔ ہوش آتے کے بعد
کی خونگوار منظر پر بھی نہیں پڑی تھی۔

وہ ایک سمجھائی خواب گاہ تھی جس کی مسہری پر اُسے ہوش آیا تھا۔
سب سے پہلے اُس کا ہاتھ کوت کی جیب پر پڑا ریو اور غائب تھا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا اور
جوتے پہن کر تیزی سے بند باندھنے لگا۔

”اے ایک بھی کیا جلدی۔“ پشت سے آواز آئی اور حمید اچھل پڑا۔
ذریںک الماری کے قریب ایک دراز قد آدمی نظر آیا جس کی آنکھوں پر تاریک اور معمول
سے زیادہ بڑے شیشوں کی عینک تھی اور موچھیں اتنی بھگنی تھیں کہ دونوں ہونٹ جھپ کر رہے گئے تھے۔
حمدید اُسکی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے موقد ملتے ہی جھپٹ پڑے گا۔

”میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں۔“ بالآخر اس نے غرا کر پوچھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے تمہارے باس ہی کی موجودگی میں گفتگو
کروں گا۔“ جواب ملا۔

”میا تمہارا اشارہ کرنے کی طرف ہے۔“

”ہاں! میں نے ان سے استدعا لکی ہے کہ وہ تشریف لا کر مجھے شکریہ کا موقع دیں۔“

”کیا مطلب...!“

”قرول نا۔!“ قاسم ہاتھ پر ہاتھ مدد کر بولا۔ ”اپنی آنکھ میں شمشیر دوسرے کی ڈاڑھی میں تکڑا
حمدید کو بھی آگئی۔ کیونکہ قاسم کے ذہن میں کئی کہاواں تسلی گذشتہ ہو گئی تھیں غالباً وہ کہنا چاہتا تھا
کہ اپنی آنکھ میں شہیر نہیں نظر آتا اور دوسرے کی آنکھ کا تینا نظر آ جاتا ہے۔ شہیر کی شمشیر نہیں
اور تکنے کے تصور کے ساتھ ہی چور کی ڈاڑھی یاد آگئی۔

”اے تو کھفا ہونے کی کیا بات ہے۔“ حمید اُس کا شانہ چکتا ہوا بولا۔ ”چلو تفریخ
کر الاؤ۔“

”نہیں قرتے تفریخ! تم بتاؤ۔۔۔ میرے باب ق۔۔۔!“

حمدید اس وقت قاسم سے بچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اپنی گاڑی وہ ایک ڈیوٹی کا نشیبل کی گمراہی میں
چھوڑ آیا تھا۔ اسے جلد ہی واپس آتا تھا اور اب تو جلد وابھی اشد ضروری ہو گئی تھی کیونکہ اس کی
دانست میں فریدی نے اس وقت اُسے ٹالنے ہی کی کوشش کی تھی۔
وہ تیزی سے چالک کی طرف بڑھا۔ لیکن اُس نے چالک کے باہر ہی رکوئی تھی۔

”اُسے میں جہنم میں بھی تمہارا پچھا نہیں چھوڑوں گا۔“ قاسم ہاتھ ملا کر چھپا۔
تحوڑی در بعده حمید کی لیکنی کا تعاقب کر رہا تھا۔ حمید نے مڑ کر دیکھا اور ہونٹوں ہی اسیں
کچھ بڑا کر رہ گیا۔ اس وقت قاسم اُسے بہت شدت سے کھل رہا تھا کیونکہ اُس کے ذہن اُس پر قہ
پوش عورت کے تصور کے علاوہ اس وقت اور کسی چیز کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

وہ کون تھی! بچکیوں اور سکیوں کے درمیان فریدی سے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ سوچتا اور بور
ہو تارہ۔ آخر فریدی نے اُسے اس طرح کوئں ٹال دیا تھا؟

اس نے پھر مڑ کر دیکھا قاسم کی کار بس تصور تعاقب کر رہی تھی۔ آخر اُس نے ڈرائیور کو دس
کا ایک نوٹ دیتے ہوئے پڑا ہتھ دی کہ وہ لیکنی کسی گلی میں موز کر فقار بہت کم کر دے۔

قاسم کو ڈاچ دیتے بغیر چھکارا نا ممکن تھا۔ لگی اُس جگہ سے قریب ہی تھی جہاں حمید نے اپنی
گاڑی چھوڑی تھی۔

”میں اتر جاؤں گا اور تم سیدھے لکھ جانا۔ سمجھے۔“ اُس نے ڈرائیور سے کہا۔

”بہت اچھا جناب۔“ ڈرائیور نے بھڑائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ بچھن وابیں لیجے۔“

”رکھو... رکھو...!“ حمید نے لاپرواں سے کہا۔ لیکن ڈرائیور نے پشت گاہ سے نکل کر اپنا

”کچھ نہیں! اس گفتگو کے لئے کرٹل کی موجودگی ضروری ہے۔“ اس نے کہا۔
”لیکن تم نے دائرے اور مثلاً کے ساتھ الوکا حوالہ نہیں دیا۔“

”مجھے الود سے دلچسپی نہیں ہے۔“ اُس نے لاپرواں سے کہا اور خاموش ہو گیا۔
جید پھر اس ثقاب پوش عورت کے متعلق سوچنے لگا جسے فریدی کو نہیں میں لے گیا تھا۔ کیا
وہ وی عورت تھی جس کا حوالہ ابھی اس آدمی نے دیا تھا؟ تو کیا فریدی تجھ کی جال میں
پھنس گیا ہو گا؟“

”لیا سوچنے لگے۔“ دراز قد آدمی نے مسکھہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

”یہی کہ تمہیں... خیر... ہٹاؤ جانے والے تم خفا ہو جاؤ گے۔ بات یہ ہے کہ میں اس بر قعہ
پوش لڑکی کی مغل نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے آواز تو بڑی دلکش تھی۔“

”وہ خود بھی بڑی دلکش ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ کوئی مقامی لڑکی ہے۔“

”لڑکوں کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ وہ تو کامبائی ہوئی ہیں۔“ بھی بادلوں سے جھاگلکتی ہیں۔ بتی
چاند اور ستاروں میں بینہ کر ستار بجائی ہیں۔ مگر آج کل ناخن بروھانے لگی ہیں اس نے روٹیاں
نہیں پا کر سکتیں۔“

”شاعر بھی ہو اور مخترے بھی۔ لیکن کیا یہ بے حیائی کی زندگی نہیں ہے۔“

”اتھی بڑی بڑی موجودیں رکھ کر لڑکوں سے جملہ کرانا یقیناً بے حیائی کی زندگی ہے۔“

”تمہاری زبان گھونے کی طرح چلتی ہے۔“

”مگر انفوس کسی کا سر نہیں توڑ سکتی۔“ جید نے ٹھنڈی سائس لے کر کہا۔ ویسے تم نے بے
حیائی کی زندگی کا حوالہ کن معنوں میں دیا تھا۔“

”تم دونوں کی موجودہ پوزیشن۔ کیا تم اپنے مغلے میں تغیر ہو کر نہیں رہ گئے۔ اب اعلیٰ حکام کو
تمہاری پرواہ نہیں ہوتی۔“

”اوہ...!“ حید سر ہلا کر بولا۔ ”تو تم محض ایک مجرم ہی نہیں بلکہ غدار بھی معلوم ہوتے ہو۔“

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ...!“ دراز قد آدمی غرایا۔

”مکام ہو گیا باس۔“ ایک آدمی نے دروازہ کھول کر کہا۔

”وہ ضرور تو تحریف لاکیں گے۔ میں بیک وقت کی جانب سے جملہ کرنے کا عادی ہوں۔
تاکہ اگر ایک ناکام ہو تو دوسرا ہی بار آور ہو سکے۔“ بھی نہیں تو تیرا... لیکن میرا خیال ہے کہ
دوسری طرف سے کیا ہوا جملہ یقیناً کامیاب ہو گا۔“

”کیا بکواس ہے۔“

”پہلا جملہ تو وہ تھا کہ تم نے اپنی کار میں الود بکھا اور نہیں پچھلے پڑھے ہوئے سارے جاؤئی
ناول بیک وقت یاد آگئے۔“ گھنی موچھوں والے نے قہقہہ لکایا۔ ”سٹنی...“ سس پس تم سے
وہی حرکت سر زد ہوئی جس کی توقع تھی۔ تم نے اپنی گاڑی و ہیں کھڑی رہنے والی اور کرٹل فریدی
کو اطلاع دیئے ووڑے پڑھے گئے۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں تم وہی تیکسی استعمال کر سکتے تھے جو
پہلے ہی سے تمہاری مختصر تھی اگر کرٹل بھی اسی تیکسی پر تمہارے ساتھ ہی آ جاتا تو ہمہر تھا لیکن
میں سے عوچا کہ کرٹل بہت بڑا آدمی ہے۔ میں الاقوامی شہرت کا مالک۔ اس نے اس پر کسی لڑکی
سے بھی عملہ کرنا تھا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں آیا لیکن وہ لڑکی اُسے ضرور لائے گی۔“

”پہلے بھی کبھی کرٹل سے سابقہ پڑھا ہے۔“ جید نے مسکھہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔
”پہلی بار یہ سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ وہ اپنے بیٹے پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر جھلکا ہوا بولा۔“

”اچھی بات ہے۔ تو منتظر رہو۔“ جید نے لاپرواں سے شانوں کو جبنش دی۔

”تم تو اس طرح کہ رہے ہو جیسے تمہیں یقین ہی نہ ہو کہ میرا دوسرا جملہ کامیاب ہو گا۔“

”اگر تم نے پہلی بار یہ سعادت حاصل کی ہے تو کچھ ہی ذریسی خوش نہیں میں ضرور جھلکار ہو۔“

”خیر... ختم کرو۔“ دراز قد آدمی نے کہا۔ ”ہم کھانے کی میز پر کرٹل کا انتظار کریں گے۔
اؤ میرے ساتھ۔“

”اچھی بات ہے تو پھر میں بھی یہیں ٹھہر کر فریدی کا انتظار کروں گا۔ تم تو کافی بد اخلاق
معلوم ہوتے ہو۔ کرٹل میری دعوت کبھی نہ ٹھکرائے۔“

”سنجیدگی سے گفتگو کرو۔“ جید نے اسے تیز نظروں سے گھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو
اور کیا چاہتے ہو۔“

”مثلاً اور دائرے کے چکر میں بیتیرے ہیں۔ مجھے بھی ان میں سے ایک سمجھ لو۔“

”اوہ... تو پھر...!“

ہو گئی اور بیک وقت کئی جنین سنائی دیں۔ ان میں شاید ایک فائز کی آواز بھی شامل تھی۔ حمید ایک گوشے میں رک گیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر فریدی نے دھوکا نہیں کھایا تو یہاں تک پہنچا بھی اس کے لئے مشکل نہ ہو گا۔

ویسے وہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ لیکن اس کمرے سے کوئی بھی نہیں گزرا جس میں حمید تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ شاندہہ اس کمرے سے گذر کر باہر نہ پہنچ سکے۔

اس نے پھر آوازوں کی طرف کان لگادی۔ لیکن اب وہاں سنانا تھا۔

پچھے دیر بعد وہ مٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پوری عمارت تاریک ہو جانے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میں سوچ آف کر دیا گیا ہے۔ میں سوچ کہاں ہو گا؟ لیکن میں سوچ کے چکر میں پڑا فضول ہی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس طرح کسی دوسرے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا۔

دروازے سے گذرتے وقت اس نے ایک ہلکی سی آواز سنی اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ انہیں کی وجہ سے اندازہ کرنا دشوار تھا کہ اب بھی وہ کسی کمرے ہی میں ہے یا کسی رہاہری میں۔ وہ دوبارہ آہستہ لینے لگا۔ ہلکی بار اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آواز کس قسم کی تھی۔ آواز پھر آئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی فرش پر آہستہ کھک رہا ہو۔ پھر اس نے ہلکی سی کراہ سنی جو غالباً شدت تکلیف ہی کا نتیجہ تھی۔ فرش سے لباس کی رگڑ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

حمدی نے سانس روک لی۔ یقینی طور پر ہٹکنے والا قریب ہی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دم لینے کے لئے رکا ہو۔

ٹھیک اُسی وقت تاریخ کی روشنی کا بڑا سادا رہ کمرے میں ریک ٹایا اور حمید اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کسی لڑکی ہی کی چیخ تھی جس نے اس کے کان پھاڑ دیے تھے تاریخ کی روشنی کا دارہ فرش پر پڑی ہوئی لڑکی پر ٹھہر گیا تھا۔ حمید نے دوسرے دروازے میں چھلانگ لگائی۔

”ٹھہر د... میں ہوں۔“ یہ فریدی کی آواز تھی۔ حمید بے تحاشہ پٹ پڑا۔



”ٹھیک....!“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”آؤ کیپن! امِ دوستانہ ماحول میں گفتگو کریں گے۔“ حمید اب بھجن میں پڑ گیا۔ کیا وہ فریدی کو بھی پھانس لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیا وہ حقیقی دھوکا کھا گیا ہو گا۔ وہ سوچتا ہوا غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ قد آدمی خاموشی سے چل رہا تھا۔ اس وقت حمید چاہتا تو بہ آسانی اس پر حملہ کر پیٹھتار لیکن یہ دیکھے بغیر کہ فریدی کس حال میں آیا ہے وہ کوئی غیر ذمہ دار ان اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہال میں پہنچ کر دروازہ قد آدمی رک گیا۔ یہاں چار آدمی پہلے ہی سے موجود تھے اور فرش پر ایک جگہ ایک بڑا سبندل پڑا ہوا تھا۔

حمدی بوکھلا گیا کیونکہ اس بندل پر کئی جگہ تازہ خون کے دھبے نظر آئے تھے۔ ”اگر گدو! تم نے ابھی تک اس تھیلے سے نکالا بھی نہیں۔“ دفتار دروازہ قد آدمی جملائے ہوئے لجھے میں بولا۔ ”اگر گھنٹن کی وجہ سے مر گیا ہو تو۔“

پانچوں آدمیوں نے بڑی تیزی سے بندل کھول ڈالا۔ لیکن بندل سے برآمد ہونے والے پر نظر پڑتے ہی دروازہ قد آدمی کسی زخمی شیر کی طرح دہارا۔ ”یہ کون ہے۔“

حمدی نے طویل سانس لی۔ یہ فریدی نہیں تھا۔ پانچوں آدمیوں کے چہروں پر ہوانیاں اڑنے لگی تھیں۔ ”یہی... تھت... تو... میں سوچ رہا تھا۔“ ایک آدمی ہکلایا۔ ”سوچ رہا تھا کہ ڈر گی کہاں رہ گیا۔“

”گدھ ہو! تم اپنے ہی ایک آدمی کو زخمی کر کے تھیلے میں ٹھونس لائے ہو۔“ دروازہ قد آدمی پھر دہاڑا۔ ”انہیں را... باس... انہیں را... ہمارا تصور نہیں ہے۔“

”انہیں کے پیچے میں کسی کو بھی زمہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کتنا کہاں ہے؟“

حمدی اب ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کچھ کر گزرنے کے لئے اس سے بہتر موقع پھرہا تھا نہ آئے گا۔ اس نے چپ چاپ ایک کر سی اٹھا کر اس زور سے دروازہ قد آدمی کی کمر پر رسید کی کہ وہ توازن کھو بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اپنے دو آدمیوں کو بھی سیٹھتا ہوا فرش پر ڈھیر نظر آیا۔ حمید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اگر وہ نہ تھا تو اس طرح کبھی نہ بھاگتا۔ بہر حال وہ ابھی دوسرے ہی کمرے میں پہنچا تھا کہ پوری عمارت تاریک

”پواہ مت کرو۔“ فریدی مسکرا لیا۔ چند لمحے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر حمید سے بولا۔
”ہاں تم یہاں کیسے آپنے تھے۔“

”میں کہتا ہوں اتنے اطمینان سے بیٹھ رکے رہنے میں کون سی مصلحت ہے۔“
”پھر کہوں گا کہ اپنے ذہن کو ان الجھنوں میں نہ ڈالو۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں کرو۔“
حمدی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی بیٹتی دہرائی اور فریدی ہٹنے لگا۔

”بھلا اس میں پہنچنے کی بات ہے۔“ حمید جھلا گیا۔
”کچھ نہیں! خواہ خواہ انگارے نہ چباؤ۔ ذرا اس بیچاری کو دیکھو۔ اس کا بازو دخنی ہے۔“
”ویکھ رہا ہوں.... پھر کیا چاہئے ہیں آپ۔“

”وہی جو یہ چاہتی ہے۔“

”اس درد نے مجھ پر فائز کیا تھا۔“ لڑکی کراہی۔

”اوہ.... تو کیا یہ گولی لگی ہے۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”پہنچنے! مجھے یاد نہیں کہ گولی لگی تھی.... یا کچھ اور.... اندر ہی رہا ہو گیا تھا۔“

”اندر ہی رکیسے ہوا تھا۔“

”وہ.... وہ....!“ لڑکی رہ رہ کر آنکھیں بچاڑتی ہوئی بولی۔ ”میرا.... سس.... سس.... چکرا رہا ہے.... مم.... مم.... میں....!“

اس کی گردن بائیں شانے پر جھوٹلی۔ آنکھیں قطعی طور پر بند ہو چکی تھیں اور وہ گھری گھری سانسیں لے رہی تھی۔

”غائب بیوشاں ہو گئی۔“ فریدی آہستہ سے بڑھا۔ پھر حمید کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اے اٹھاؤ۔“

”سمال ہے.... یعنی کہ میں.... یعنی کہ اتنی خوبصورت لڑکی۔“

”اٹھاؤ.... اور میرے ساتھ چلو۔“ فریدی نے سخت لکھجے میں کہا۔

”ٹو ٹو اکھاں کہا حمید نے یہ خونگوار فرض ادا کیا۔ فریدی ہی کی رہنمائی میں وہ عمارت کے باہری حصے میں پہنچا۔ یہ ایک مختصر سلسلہ میں باغ تھا۔

”اے تو آپ نے ٹلاشی بھی نہیں لی۔“ اس نے فریدی سے کہا۔

زخمی لڑکی

فریدی کے باکیں ہاتھ میں ٹارچ تھی اور داہنے میں رینوالر۔
حمدی احمقوں کی طرح منہ کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی گھشتی ہوئی دیوار تک پہنچی تھی اور اب شائد کوشش کر رہی تھی کہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے لسکے۔

روشنی کا دائرہ اب بھی اسی پر تھا۔ اور وہ نہری طرح ہاتپ رسی تھی۔ شائد وہ جواب دیجے ہوئے ذہن ہی کو قابو میں رکھنے کے لئے بار بار آنکھیں بچاڑ رہی تھی۔ اس کے خدوخال و لکش تھے۔ حالانکہ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ لیکن خوف بھی اس کے چہرے کی دلکشی پر کوئی نہ اڑ نہیں ڈال سکتا۔

”کیا وہ نکل گئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”پھر بتاؤں گا۔ بہر حال میں قیدی تھا۔“ حمید نے کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

”اٹھو....!“ فریدی نے لڑکی سے تھکانہ لے جائیں کہا۔

”میں اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ لڑکی یوریشین معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دائیں بازو پر زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

”وہ لوگ کہاں گئے؟“

”میں نہیں جانتی جناب۔ قطعی نہیں جانتی یقین تکھی۔ مجھے گرفتار کر لیجئے۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔“

”تمہاری گرفتاری سے کیا فائدہ۔ نہیں تمہیں بیٹھ چھوڑ جاؤں گا۔“

”نہیں نہیں۔ وہ ہندیانی انداز میں چینی۔“ مجھے گرفتار کر لو۔

”کیوں.... کیا وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“

”چلے! نکلے یہاں سے۔ ورنہ وہ واپس بھی آسکتے ہیں۔“

”اس کی فکرنا کرو۔“ فریدی نے کہا اور نہیک اسی وقت کرے میں روشنی بھی ہو گئی۔

”ویکھے....!“ حمید چینا۔

”مجھے پچانی ہو جائے گی اور وہ ستار بجائے گی۔ اس کی بھی پرداہ نہ کرو۔ آہام نے ابھی تک
نہیں پوچھا کہ میں اپاٹک وہاں کیسے آپنچا تھا۔“
”مجھے علم ہے کہ وہ برقدہ پوش عورت.....!“
”ٹھیک! وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی اور اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ نصیری کی سیکریٹری
تھی۔ پچھلی رات وہ اپنے قلیٹ میں سورہی تھی کہ کڑکی توڑ کر تین چار نقاب پوش اندر گھس
آئے۔ انہوں نے اُسے اٹھا لے جانا چاہا۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت دو تین نقاب پوش اور پہنچے اور اُن
کے درمیان اچھی خاصی جگہ چھڑ گئی۔ اسی دوران میں اُسے اپنے قلیٹ سے نکل بھانگنے کا موقع
مل گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کسی بہت بڑے خطرے سے دوچار ہونے والی ہے۔ پھر اس نے
نصیری کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہ ذوق تجسس بھنجھوڑے بغیر ہی جاگ اٹھا۔ مثال کے
طور پر اُس نے بتایا کہ وہ نصیری کو جسمہ ساز کی حیثیت سے نہیں جانتی تھی وہ اُسے کوئی اسکار
سمجھتی تھی۔ اُس نے ایک عمارت کا نام لیا تھا کہ وہ اس میں نصیری کے کتب خانے کی دیکھ بھال
کرتی تھی اور اس کی ڈاک وصول کرتی تھی۔ تیرے چوتھے دن نصیری بھی وہاں جاتا تھا اور وہ
اُسے ڈاک دیکھنے میں مدد دیتی تھی۔ عمارت کی کنجیاں اس کے پاس ہی تھیں۔ جو اُس نے بے چول و
چرا میرے حوالے کر دیں۔ مگر میں اُسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ خائف
تھی۔ لیکن پھر ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس تاریک عمارت میں پہنچ کر
میں تھا رہ گیا ہوں۔ وہ اندر ہیرے میں کسی دوسری طرف کھک گئی تھی۔ پھر چند آدمی مجھ پر ٹوٹ
پڑے۔ اندر ہیرے کی وجہ سے میں انہیں ڈاک دیتے میں کامیاب ہو گیا اور انہوں نے میرے
دو ہوکے میں اپنے ہی ایک آدمی کو مار لیا۔ شاید اندر ہیرے ہی میں اُسے تھیلے میں بھی ٹھونسا گیا تھا۔
ظاہر ہے کہ اُس کے بعد میں نے ان لوگوں کا تعاقب ضرور کیا ہو گا۔ لیکن بلا آخرہ نکل ہی گئے۔ گھر
سے چلتے وقت میں نے جن لوگوں کو فون کیا تھا وہ ذرا دیرے سے پہنچ تھے ورنہ وہ لوگ نکل نہ سکتے۔“
”مجھے کے آدمی تھے۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں....!“
”بلیک فورس....!“
”ظاہر ہے۔“

”سب کچھ ہو رہا ہے فرمات کرو۔“
جیپ کار سڑک پر کھڑی تھی۔ حمید نے لڑکی کو پچھلی نشست پر ڈال دیا۔
”اسے کہاں لے چلیں۔“ اُس نے فریدی سے پوچھا۔
”پولیس ہپتال....!“
”غلطی کریں گے آپ انہیں میری دامت میں تو یہ مناسب نہیں ہے۔“
”فرمات کرو۔ تم خواہ خواہ ان الجھنوں میں پڑتے ہو۔“
”آپ وہاں بتائیں گے کیا۔“
”یہی کہ ہمیں سڑک پر بیہوں پڑی میں تھی۔“
”میا عقندنی ہے اس میں۔“
”مجھے کی کوشش کرو۔ یہ لڑکی ہمارے لئے کام کی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے
متعلق صحیح بیان دے دیا گیا تو یہ حوالات میں ہو گی۔“
”اوہ.... تو اسے آپ ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔“ حمید نے طویل سانس لی۔
”بہت دیر میں مجھے لگے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔“ فریدی نے تھیرانہ لجھ میں کہا۔
ہوک کے مارے حمید کا دم نکلا جا رہا تھا۔ اس لئے اُس نے بجھ دیں ختم کر دی۔ کیونکہ
ہوک کے عالم میں بکواس کرنے سے سارا ذرخیل معدے پر پڑتا ہے اور قلب اتنے لگتا ہے۔
پولیس ہپتال پہنچ کر وہ باہر جیپ ہی میں بیٹھا رہا تھا اور فریدی بیہوں لڑکی کو اسٹرپ پر ڈالا
کر اندر لے گیا تھا۔ تقریباً میں منٹ بعد اُس کی واپس ہوئی اور اُس نے بتایا کہ لڑکی کو ابھی تک
ہوش نہیں آیا۔
”تو پھر آپ نے بیان بھی نہ دیا ہو گا۔“ حمید نے کہا۔
”کیوں بیان دیئے میں کون سی دشواری تھی۔“
”دیکھنے ہوک کی حالت میں مجھے زبان پر قابو پاناد شوار ہو جاتا ہے۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔
”اس جھلاہٹ کی وجہ... فرزند...!“
”وہ ہوش میں نہیں تھی۔ آپ یہ فرمائ کر چلے آئے کہ کسی سڑک پر بیہوں ملی تھی۔ اب اگر
اُس نے ہوش میں آکر کوئی دوسری بکواس کر ڈالی تو کیا ہو گا۔“

گمنہ جائے۔ وابھی خواہ کسی وقت ہو۔
”میرا خیال ہے....؟“ فریدی نے حید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”میرا مجھے تھا جانا پڑے گا۔“
”ظاہر ہے۔“
”مگر میں کہوں گا کیا۔“
”اب یہ بھی میں ہی تباہ۔ یوں بکواس کر کے دوسروں کی کھوپڑیاں بھی خالی کر دیتے ہو۔“
”خیر میں سمجھ بوجھ لوں گا۔“ حید نے لاپرواں سے شانوں کو جبٹ دی۔
”آلواب بھی کارہی میں موجود تھا۔“ حید نے اس کے متعلق پوچھا۔
”غیرت کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے کہ تم آج ہی سے الپوری شروع کر دو۔“ فریدی نے
سکرا کر کہا۔
”آخر ہم لوگوں کو چھاننے کی کوشش کیوں کی گی۔“ حید نے بات اڑا دی۔
” غالباً وہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم لوگ نصیری تک کیوں جا پہنچ تھے، ظاہر ہے کہ کسی کو
کسی خاص بات کے ظاہر ہو جانے کا خدا شما ای لئے نصیری قتل کر دیا گیا تھا۔“
حید کچھ نہ بولا۔ یک بیک اس کے قدم کیفے شبانہ کی طرف اٹھ گئے۔ وہ اسی سڑک پر تھا اور
رات بھر کھلا رہتا تھا۔
”مہربو بھی! میں چل رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن کیفے میں
پھی کر اس کارخ کسی میز کی بجائے کاؤنٹر کی طرف تھا۔
کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون پر اس نے پولیس ہسپتال کے نمبر دائل کئے۔ حید ایک میز پر جم.
گیا تھا اور اس انداز میں دشیر کو ہدایات دے رہا تھا جیسے آج کیفے کی پنجی کھنچی ساری چیزیں اس کے عقی
پیٹ کا ایندھن بنیں گی۔ فریدی تقریباً تین منٹ تک فون پر گفتگو کر تارہ پھر دہ بھی میز پر چلا آیا۔
”ہوش آیا اے۔“ حید نے پوچھا۔
”آچکا ہے۔“ فریدی مسکرا یا۔ ”اور تمہیں حیرت ہو گی کہ میرے اور اس کے بیان میں سرمو
فرق نہیں ہے۔“
”میرا مطلب...!“

”کب میری سمجھ میں آئے گی یہ بلکہ فوراً۔“ حید نے خندی سانس لی۔
فریدی کچھ نہ بولا۔ حید بھی خاموش ہو گیا۔ جیپ کاراب کو تھی ہی کی طرف جا رہی تھی۔
”دوسری بات۔“ فریدی نے کچھ دریہ بعد کہا۔ ”جانتے ہو وہ لڑکی کون تھی۔“
”بیلجم کی شہزادی۔“
”بری طرح جملے ہوئے ہو۔“ فریدی فس پڑا۔ ”وہ لڑکی وعی ہے جسے ابھی ہم پولیس
ہسپتال میں چھوڑ کر آئے ہیں۔“
”نہیں...!“ حید نے تھیر ان سمجھ میں کہا۔
”ہاں... وہی ہے۔“
”اور آپ نے اسے اس طرح...!“
”ہاں... آں۔“ فریدی نے بات کاٹ دی۔ ”میں دراصل اس وقت کے ذرا سے
مطمئن نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے ایسا ہی لگا ہے جیسے میں نے کسی ذرا سے کے رسیروں میں
 حصہ لیا ہو۔“
”میں نہیں سمجھا۔“
”میرا خیال ہے کہ کل تک سمجھ جاؤ گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ادا بھی تمہاری گاڑی وہیں
 ہو گی جہاں تم نے چھوڑی تھی اور میرا خیال ہے کہ تمہارا آلواب تک کافی مشہور ہو چکا ہو گا۔ کچھ
 تجуб نہیں کہ بات ہمارے ایسی پی صاحب تک بھی پہنچ گئی ہو اور ہمیں اس سلسلے میں باقاعدہ طور
 پر جواب دہی کرنی پڑے۔“
فریدی کا خیال غلط نہیں تھا۔ حید تقریباً آٹھ بجے اپنی گاڑی کا نشیبل کی تحویل میں وے کر
 فریدی کے پاس پہنچا تھا اور اب ڈھانکی نکر رہے تھے۔ کا نشیبل نے دو گھنٹے بعد ہی ترقی تھانے میں
 اس کی اطلاع بھجوادی تھی۔ وہاں سے بات ٹکمہ سراغ رسانی کے ایسی۔پی تک پہنچی تھی۔
مگر کار جہاں چھوڑی تھی وہیں تھی۔ البتہ اب کوئی دوسرا کا نشیبل اس کی گمراہی کر رہا تھا اور
 ساری باتیں اسی سے معلوم ہوئی تھیں اس نے بتایا کہ ایسی۔پی نے بذات خود آکر حید کی گاڑی کا
 جائزہ لیا تھا اور اسے ایک تحریر دے گیا تھا جو حید کے نام تھی اور جس میں کہا گیا تھا کہ حید جس
 وقت بھی کار کا نشیبل کی تحویل سے واپس لینے والیں پہنچے اسے چاہئے کہ وہ ایسی۔پی سے ملے بغیر

”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ۔“
 ”اگر یہ بات نہ ہوتی تو تمہاری گاڑی میں لوکی بجائے نائم بم رکھا جاتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مجھ پر اندر ہیرے میں محلہ کر کے اپنا ہی ایک آدمی نزدِ گریا جاتا۔ تم کہتے ہو کہ وہ تھیلا تمہاری موجودگی میں ہی کھولا گیا تھا اور لبے آدمی کو اچانک اپنے ساتھیوں کی حفاظت کا علم ہوا تھا۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت ہوتی تو وہ مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتے تھے۔ اتنی فاش غلطی کا احساس ہوتے ہی انہیں بوکھلا جانا چاہئے تھا لیکن تمہیں یہ سن کر خیرت ہو گئی کہ وہ بہت اطمینان سے فرار ہوئے تھے۔ یعنی اپنے بیویوں ساتھی سمیت نکل گئے تھے۔ یقین کرو کہ اگر وہ فرار بھی ان کی ایکم میں پہلے ہی سے شامل نہ ہوتا تو وہ بچ کر نہیں جاسکتے تھے۔ میں نے بہت اختیاط سے کام لیا تھا۔“

فریدی نے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”تمہارا بیان ہے کہ تم نے فائز کا مقصود کیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے لڑکی ہی پر فائز کیا ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”ضروری تو نہیں تھا کہ گولی لگ ہی جاتی۔“
 ”ہاں ضروری نہیں تھا لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ بھی میرا ہی بیان دہراوے اور اتنی صفائی کے ساتھ کہ ایک لفظ کا بھی فرق نہ پڑنے پائے۔“

”اٹ پر البتہ غور کیا جاسکتا ہے۔“ حمید نے کپ میں چائے انٹیلیت ہونے کہا۔

”اُس کا مقصد یہ ہے کہ وہ جیل میں رہنے کی بجائے ہماری گرفتاری میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔“

”اور وہ حقیقتاً بیویوں بھی نہیں تھیں... کیوں؟“

”اگر ہوتی تو میرا بیان من د عن کیسے دہرا سکتی۔“

”حالانکہ پہلے اُس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ بس وہ کسی طرح بھی ہی گئی اور اب صرف جیل ہی میں رہنا چاہتی ہے جہاں وہ ان لوگوں کے انقام کا شکار نہ ہو سکے۔“ حمید نے کہا۔

فریدی پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”حالات کی سمت بھی نہیں لے جاتتے۔“ کچھ دیر بعد حمید بڑا یا۔

”ن لے جاتے ہوں۔“ فریدی نے لاپرواں سے کہا اور بجھا ہوا سگار سلگا کر بولا۔ ”بہر حال

”اُس نے بھی بتایا ہے کہ وہ ریگل اسٹریٹ سے گزر رہی تھی کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اُس کے قریب سے گزری۔ دھکا لگا اور وہ دور جا گئی۔ اس کے بعد اسے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔“
 ”بازو کے زخم کے متعلق کیا بتایا۔“

”وہ تو کچھ بھی نہیں بتا سکی۔ لیکن ڈاکٹر کا خیال ہے کہ زخم کسی دھاردار آئے کا ہے۔“
 ”آپ نے بھی ریگل اسٹریٹ ہی کا نام لیا تھا۔“

”ہاں۔ دیکھو۔ میں نہ کہتا تھا کہ اس کی فکر نہ کرو۔ عموماً ہی ہوتا ہے، جو میں چاہتا ہوں۔“
 ”میں اس وقت زیادہ اوپر جاتی نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ فی الحال میرا ہیں مدد میں اتر گیا ہے۔“ اُس نے دیکھ کی لائی ہوئی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے ہاں میں نظریں دوڑائیں اور پھر سیدھا ہو کر کسی کی پشت سے نکلا ہوا بولا۔ ”پچھلی رات اُس پر اسرار گاڑی سے ہم پر فائر ہوئے تھے لیکن ایک بھی گولی ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ حالانکہ ہم پوری طرح روشنی میں تھے۔ ہماری گاڑی کا بھی دبی حرث کیوں نہیں ہوا جو دوسرا کا ہوا تھا اور وہ لڑکی جو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ملی تھی ہو سکتا ہے کہ اُس کے ذہن میں کوئی دوسرا ایکم رہی ہو۔ لیکن تمہاری زبان سے لفظ الوں کو سن کر وہ بوکھلا گئی تھی اور اس کے ساتھی بھی اتنے ہی خوفزدہ ہو گئے تھے کہ پھر ان سے ہاں نہیں ٹھہر اگیا تھا۔ کار کے حادثے میں کام آنے والوں میں سے ایک کی جیب سے صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا تھا جس پر اُو مثاث اور دائرے کے کھڑاگ کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیا تھا۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ حمید منہ چلاتا ہوا بولا۔

”کہاں بڑے ڈرائیکٹ انداز میں سیٹ کی گئی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”دپار نیاں ہیں حمید صاحب۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر داؤن کی قائل ہو سکتی ہے۔“
 ”اتنا تو میری سمجھ میں آگئی ہے ظاہر ہے کہ اُس کار کی تباہی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔“

”ایک پارٹی سے اس وقت بھی ہماری مذکوری بھیز ہو چکی ہے۔“

”چلے یہ بھی تسلیم ہے۔“

”لیکن یہ پارٹی حقیقتاً ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتی ہے۔“

اپنے ایسے بدل کیوں دی۔
میڈ کی کہانی بیان کر کے وہ اپنی داستان بھی دہرانے لگا۔ جس میں لوکی کا تذکرہ ضروری تھا۔
”بھی ہوں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ لڑکی پولیس ہوتا میں زیر علاج ہے۔ بس کہانی اُسی
”جس قسم ہو گئی تھی جہاں سے وہ معلوم افراد فرار ہوئے تھے۔
” تو کہ اس کا تعلق نصیری کے قتل سے بھی ہو سکتا ہے۔ اُس پی نے پوچھا۔
” ہو سکتا ہے نصیری غلطی سے قتل ہو گیا ہو۔“

”میا مطلب....!“
”گوئی مجھ پر چلائی گئی ہو۔ نشانہ خطا کرنے کی بنا پر نصیری زد میں آگیا ہوا اور حملہ آور نے
ہاتھ ہونے پر اب میرے لئے باقاعدہ طور پر کوئی جال بچالیا ہو۔“
”اُس پی اُسے اشیاء آمیز نظروں سے دیکھا رہا بھر بولا۔“ مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر داؤد اور
نصیری اگر بری دوست تھے اور ڈاکٹر داؤد بھی ایک اچا جسمہ ساز تھا۔“

”ممکن ہے۔“ فریدی نے لاپرواٹی سے کہا۔
”دفعہ ایسیں پی کا چھرو سرخ ہو گیا اور اس نے فریدی کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”کیا آپ نے مجھے پورے واقعات بتائے ہیں۔“
”جی ہاں فریدی کو منی خیز نظر دل سے دیکھا۔ لیکن اسے فریدی کی آنکھوں میں سکون ہی
سکون نظر آیا۔ غصے کی ہلکی سی جھلک بھی نہ دکھائی دی۔ اُس نے منکرا کر کہا۔
” ہو سکتا ہے کہ میں نے کچھ نہ کچھ صرف اپنی ہی ذات تک حدود رکھنا مناسب سمجھا ہو۔“

”کیا مطلب....!“ اُس پی کا پارہ ہری چڑھ گیا۔
”جی ہاں! ڈاکٹر مجبوراً اس کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔“
”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟“
” یہ میرے لئے ایک افسوس ناک اطلاع ہو گی کہ اب میری ہوشمندی پر بھی شبہ کیا جانے
لگا ہے۔“
”بہت زیادہ اڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا کیا انعام ہو گا۔“
”میں بالکل نہیں سمجھا جتاب۔“

اس وقت جو کچھ بھی ہوا ہے محض اسی لئے اسٹیچ کیا گیا تھا کہ لڑکی ہمارا اعتماد حاصل کر سکے۔ کوئی
پارٹی یہ کیوں چاہتی ہے۔ اسے البتہ دیکھنا پڑے گا۔“
”میا یہیں پارٹی داؤد اور نصیری کی قاتل بھی ہو سکتی ہے۔“
”ممکن ہے۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”یک یہک حمید نے بوکھلا کر چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ کیونکہ اُن کے مجھے کا اس۔ پی کیفے
میں داخل ہوا تھا۔ وہ اجھے موڈ میں معلوم ہوا تھا۔
”وہ دونوں انٹھ گئے۔“

سرخ روشنی

فریدی نے اس کی آمد پر حیرت ظاہر کی اور پھر جلدی سے بولا۔ ”تشریف رکھنے جتاب۔“
”نہیں! میں باہر ہی انتظار کروں گا۔“ اُسیں پی نے غصیلے لہجے میں کہا۔
”ہم چل رہے ہیں۔“ فریدی نے بڑے سر سے غصہ آیا تھا۔ لیکن یہاں تو اپنی ہی بوئیاں نوچنے کا
کاؤنٹر پر پیسے او کرنے لگا اُسے بہت زور سے غصہ آیا تھا۔ لیکن یہاں تو اپنی ہی بوئیاں نوچنے کا
بھی موقع نہیں تھا۔

فریدی اور اُس پی فٹ پا تھے ہی پر ملے۔ اُس پی کہہ رہا تھا۔
”یہ کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے آپ لوگوں نے۔“

”ہنگامہ....!“ فریدی مسکرایا۔ ”ہم تو ہمیشہ ہنگاموں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔
لیکن ہنگامے ہمارا یچھا نہیں چھوڑتے۔ اگر آپ کا اشارہ حمید کی کار میں پائے جانے والے الوکی
طرف ہے تو یہ ایک مجبوری تھی اس بیگارے کو اپنی گاڑی میں ایک سختی خیز چیز نظر آئی اور یہ مجھے
اطلاع دینے چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں گاڑی کسی نہ کسی کی گرفتاری ہی میں چھوڑنی
پڑتی... بہر حال میں لئے اُسے کوئی آہست نہیں دی اور حمید کو واپس جانا پڑا۔ اُس کے بعد
دوسرے واقعات پیش آئے۔“

فریدی حمید کی گرفتاری کے واقعات دہراتا رہا۔ حمید تھیر تھا کہ آخر یہک فریدی نے

”پولیس ہپتال میں آپ نے جس بُکی کو داخل کیا تھا اب اس نے اپنے بیان تبدیل کر دیا۔
”اوہ...!“ حمید نے طویل سانس لے کر پلکیں بچپا کیں۔

لیکن فریدی نے پر سکون لجھے میں کہا۔ ”مجھے علم تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔“

”اور غالباً یہ بھی جانتے ہوں گے مگر صبح آپ کو محظی کا پروانہ مل جائے گا۔“

”میں نہیں بھی سلکا کر اس نے اپنے بیان میں کس قسم کی تبدیلی کی ہو گی۔“

”آپ نے اُسے غلط بیان دیئے پر مجبور کیا تھا۔ اُس نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اُنہیں کو فیڈ نسل کے ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ اتنے کو فیڈ نسل کہ جن کی آج تک حمید کو ہوا بھی سلسلے میں۔“

”ظاہر ہے کہ اب میں کیا کہہ سکوں گا۔“

”آخر آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

”مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ نہیں بتا سکوں گا۔“

”بہتر ہے۔“ ایسی پی غریباً اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

فریدی اور حمید وہیں کھڑے رہے۔ جب ایس۔ پی کی گاڑی چلی گئی تو حمید نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”محظی کی نوبت آگئی۔“

”پرواہ مبت کرو۔ اب تم مجھے اُس آدمی کے متعلق بتاؤ جو اس ہنگامے کا ذمہ دار ہے۔“

”اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔ سب کچھ تو بتاچکا ہوں۔“

”کیا اس کی موچھیں مصنوعی تھیں۔“

”شبہ ہوا تھا۔“

”اوپری ہونٹ کی بناوٹ کے متعلق کچھ بتا سکو گے۔“

”چکانوں کھانی نہیں دیا تھا۔ آپ اوپری ہونٹ کی بات کر رہے ہیں۔“

”اتی گئی اور لکھی ہوئی موچھیں تھیں؟“

”میں...!“

”تم نے کہا تھا کہ عینک کے شیئے معقول سے بڑے تھے۔ آخر کتنے بڑے ہوئی گئے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ پیشانی کے وسط تک پہنچتے تھے۔“

”ہوں... اچھا۔“ فریدی ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔“

”وہی گاڑیوں کی طرف واپس آئے اور حمید نے اُلو کو پکڑ کر سڑک پر دے چکا۔

”مگر پہنچ کر حمید نے محسوس کیا کہ یہ رات یونہی گذر جائے گی۔ کیونکہ فریدی خواب گاہ کی لگن جانے کی بجائے لا بہر یہی ہی میں جنم گیا تھا اور اب اُس الماری کا قفل کھول رہا تھا جس میں اُنہیں کو فیڈ نسل کے ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ اتنے کو فیڈ نسل کہ جن کی آج تک حمید کو ہوا بھی اُنہیں لگی تھی۔“

”میا یہ صبر کی رات ہے۔“ حمید نے مختندی سانس لے کر پوچھا۔

فریدی چوک کر اس کی طرف مرا لیکن دیکھنے کا انداز ایسا ہاٹھیے ہے۔ اُس نے صرف اُس کی آواز لی ہو۔ الفاظ پر دھیان نہ دیا ہو۔

”تم نے اُس آدمی کے متعلق مجھے سب کچھ بتا دیا ہے؟“ اُس نے سوالہ انداز میں کہا۔ ”وہیں
ہاتھ مار کر کہا۔“

”وہ بارہ زور دو۔“

”وہیں پر زور دوں۔“ حمید آنکھیں چھاڑ کر بولا۔ ”وہیں کا تناقضہ تو اس وقت یہ ہے کہ تجھے نہ
ہاتھ مار کر کہا۔“

”فریدی اور حمید وہیں کھڑے رہے۔ جب ایس۔ پی کی گاڑی چلی گئی تو حمید نے اپنی پیشانی پر
ہاتھ مار کر کہا۔“

”جھنوجوڑہیں کو میری خاطر۔ میری نہیں بلکہ اپنی خاطر درنہ صبح کسی کو منہ دکھانے کے
امل بھی نہ رہ جاؤ۔“

”ارے تواب کیا بتاؤ۔“

”اس کی چال پر غور کیا تھا۔“

”اوہ... ہاں... چال میں ہلکی سی لنگر اہم تھی۔“

”گلڑ...!“ یہ بیک فریدی کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چک لہرائی اور اس نے اپنی پیشانی
اگر تھوئے پوچھا۔ ”تاک کی بناوٹ“

”گلدھے کی دم سے مشابہ تھی۔“ حمید پھر جھلا گیا۔

”بُکاں نہیں۔“

”میں نے دھیان نہیں دیا۔“

فریدی نے الماری سے ایک فالا اور اس کے اوراق اٹھے گا۔ پھر تھوڑی ذیر بعد سر

”سیاہ ہوش کی باتیں ہیں۔“ ایں۔ پی کی آواز بے حد غصیل تھی۔
”اس وقت میرا تعلق بھی آپ کے مکھے سے منقطع ہو چکا ہے۔“

”شام کے بہت زیادہ پی گئے ہو۔“ دوسرا طرف سے آواز آئی۔

”میں آپ کو یہی مفید مشورہ دوں گا کہ خاموشی اختیار کیجئے۔ میں اپنے آفسروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ لہذا مجھے اس پر مجبور نہ کیجئے کہ میرا کوئی قدم مجھے ڈپلن کی حدود سے باہر لے جائے۔ بہتر ہو گا اگر آپ اس سلسلے میں وزارت داخلہ کے سیکریٹری سے گفتگو کریں۔ وہ آپ کو ہائیگی کہ ہیں الاقوای معاملات میں میں صرف ایک ہی ذمہ دار ہستی کو جوابدہ ہوں۔ لیکن شام کے

”آس ذمہ دار ہستی کی نشاندہی وہ بھی نہ کر سکیں۔“
”دوسری طرف سے سلسہ منقطع ہو گیا۔“

”ایں۔ پی صاحب۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں... وہی تھے۔ بیچارے نئے آدمی ہیں۔ کسی نے انہیں ہمارے خلاف بھڑکا داہے۔ خیر۔“

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میجر واللہ اعتمادی سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتا ہے۔
”یک بیک وہ بھر کسی سوچ میں پڑ گیا اور حمید بولا۔“ آخر لڑکی نے اپنے بیان کیوں بدل دیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ میرا ہی بیان من و عن دہرا دینے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو۔“

لیکن بیان تبدیل کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اسے یہی سوچی ہو گی کہ
ازام مجھ پر رکھ دے۔ کہہ دے کہ میں نے ہی اسے بیان دینے پر مجبور کیا تھا۔“

”مگر اس طرح وہ ہمارا اعتماد حاصل کر سکے گی۔“

”وہیکو بھی اودہ بھی محض قیاس ہی تھا کہ لڑکی ہمارا اعتماد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہو سکتا ہے
اُس کے بیان میں صداقت ہی ہو۔ لیکن یہ بات بالکل اٹل ہے کہ میجر واللہ ہم سے کسی قسم کا
فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ورنہ اُس کے آدمی ہمیں اب تک ختم کر چکے ہوتے۔ اگر وہ ہمیں کوئی اہمیت
ہی نہیں دیتا تو یہ چھیر چھاز بھی بے مقصد نہیں ہو سکتی۔“

”وہ ہم سے کیا فائدہ اٹھائے گا۔“

”تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ حالانکہ سنگاپور میں تم بھی جاپانیوں کے خلاف
لڑ چکے ہو۔ سیکرٹ سروس سے بھی تمہارا تعلق رہ چکا ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ جن دونوں تم
لے رہے ہیں۔“

اٹھائے بغیر بولا۔ ”ادھر آؤ۔“

”حمد نے اوگھتے اوگھتے چونکہ کہا۔“ سوار دے سیر۔“

”ادھر آؤ... ورنہ کل سے ترکاریاں ہی پیچھی پڑیں گی۔“

”حمد اٹھ کر لڑکھا تاہا ہوا بیڑ کی طرف آیا۔ لیکن قائل کے صفحے پر بچکی ہوئی تصویر
پڑتے ہی تیندر روپچک ہو گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے تصویر کو گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس
ہونت ملے اور بھلکی ہی آواز نکلی۔ ”آؤ...!“

فریدی نے انگلیوں سے تصویر کی پیشانی اور ٹھوڑی ڈھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب تاک پر غور کر۔“

”میں یعنی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی تاک ایسی ہی تھی۔ یہ کون ہے۔“

”میجر واللہ! بچپن جنگ کے دوران اتحادیوں سے کٹ کر دشمنوں سے جالملا تھا۔“

”حمد بے اعتباری سے بہل۔ پھر بولا۔“ خدارا کہیں کسی شیخ نعمتو کو میجر واللہ نہ بنادیجئے گا۔

”کیا مطلب....!“

”اڑے اس نے خالص لکھنؤی اردو میں مجھ سے گفتگو کی تھی۔“

”اور تم سے عربی۔ فارسی اور پشتو میں بھی بالکل اہل زبان ہی کی طرح گفتگو کر سکتا ہے
صاحب۔“

حمد کی نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اچانک فون کی گھٹٹی بھی اور فریدی نے رسیور اٹھا۔

”دوسری طرف سے مکھے کے ایں۔ پی کی آواز آئی۔“

”اُس عمارت میں جہاں تمہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔“ ایں۔ پی نے پوچھا۔ ”تم دونوں
علاوہ اور کون کون تھا۔“

”ظاہر ہے کہ آپ کو اس لڑکی کے متعلق علم ہو ہی چکا ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”وہاں پہنچا ایسے۔ آدمی بھی دیکھے گئے تھے جو انگلیوں کے نشانات ٹالش کر کے ان کے
لے رہے تھے۔“

”یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ میرے ہی آدمی ہو سکتے ہیں۔“

”تمہارے آدمی۔“ ایں پی غریباً۔

”میں ہاں۔ لیکن ان کا تعلق آپ کے مکھے سے نہیں ہے۔“

سکرٹ سروس میں تھے تمہارا ایک اعلیٰ آفیسر میرزا اللہ بھی تھا۔ مشرق بعید ہی میں وہ اختادیوں سے علیحدہ ہوا تھا۔

”آپ تو میرے ذہن پر ہتھوڑے چلا رہے ہیں۔“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اگر تم نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سناتے جیسیں اس پر حیرت بھی نہ ہوئی چاہئے۔ کیونکہ تم اپنے امیڈیٹ آفیسر کے علاوہ اور کسی کو جان بھی کیسے سکتے۔ دوسرے جنگ میں حکومتی نظام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔“

”چلنے والے۔ لیکن میں نے پوچھا تھا کہ وہ ہم سے کس قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟“

”فائدہ...!“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر داؤد کا قتل بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اُس سے قاتل کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو اُس کی زبان سے ”اُکو“ لکھا تھا۔ جس طرح لفظ اُسکے بے مقصد نہیں تھا اُسی طرح مثلث اور دارہ بھی کچھ نہ کچھ مفہوم رکھتے ہی ہوں گے۔ اُکو کہنے کی وجہے وہ قاتل کا نام بھی لے سکتا تھا۔ اگر قاتل پہلی بار اچانک سامنے آیا تھا تو پھر داؤد کی وہ فون کا لے بھی ہو کر رہ جاتی ہے جس کے ذریعہ اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی۔ سٹی کو اپنی زندگی خطرے میں ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے یعنی طور پر وہ قاتل سے اچھی طرح دا فق تھا۔ جلویہ بھی تسلیم ہے کہ وہ میرزا اللہ کو اس کے اصل نام سے نہ جانتا رہا ہو لیکن کسی نہ کسی نام سے جانا تو ضروری ہے۔ اکوے مجھے کے حوالے پر نصیری بھی خائف نظر آیا تھا اور ٹھیک اسی وقت وہ بھی موت کی آنکھوں میں جاسویا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ”اُکو“ اُن کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اگر اجنبی نہیں تھا تو اس کا کچھ نہ کچھ نام بھی ہونا چاہئے۔ لیکن داؤد نام لینے کی وجہے شخصیت کی تصوراتی تکمیل کا حوالہ دیتا ہے۔“

”تصوراتی“ تکمیل کے لیکن بھپکائیں۔

”ہاں! اس تصویر کو غور سے دیکھو۔ کیا دیکھتے ہی بے اختیار اکو کہنے کو دل نہیں چاہتا۔ بھنوں کی مخصوص بناوٹ اور آنکھوں کے نیچے کی ہڈیوں کا مخصوص انعام۔ کیا یہ کسی اُوکی آنکھیں نہیں معلوم ہو تیں لذات اُوکی چونچ ہی سے مشابہ نہیں ہے۔ بہر حال داؤد نے مرتبے وقت قاتل کی تصوراتی تکمیل ہی کا حوالہ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت اس کی ذہنی رو و مخصوص تجربات کی سطح پر بہر ہی تھی۔ یعنی تصوراتی تکمیل کے تجربات کی سطح پر۔ لہذا ہو سکتا ہے مثلث

اور دارہ بھی کسی چیز کی تصوراتی تکمیل ہوں۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ چیز قتل کی وجہ سے تعلق رکھتی ہو۔ تم نے شائد مجھے بتایا تھا کہ میرزا اللہ نے تم سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن شائد اور دارے کی فکر میں ہے۔“

”ہاں غالباً اُس نے یہی کہا تھا۔“

”بس تو پھر سمجھ لو کہ وہ صرف ہماری معلومات سے فائدہ اٹھانے کے پکڑ میں ہے حالات کو ضرورت سے زیادہ پہنچا رہا تھا۔“ اسرا رہا کہ ہماری زیادہ تر توجہ اُن کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہے۔“

”بالکل سمجھ میں نہیں آرہا۔“ حید نے بے بس سے سر ہلا کر کہا۔

”انتظار کرو۔ بہت جلد سمجھ میں آجائے گا۔“ میرزا اللہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کا باہر ہے۔ شائد نصیری سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا۔“

”آپ نے دوپار ہیوں کا حوالہ دیا تھا۔“

”ہاں اس معاملے میں دوسروی اہم چیز یہی ہے۔ اگر دوپار ہیوں کا معاملہ نہیں تھا تو حادثے میں تباہ ہو جانے والی کار کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کار میں کچھ ایسے لوگ تھے، جنہوں نے ہمارا ہمارا تعاقب کرنے والے کا تعاقب کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت کا باعث بھی وہی بنا ہو گا جس نے کاغذ کا ایک نکلوا بر آمد ہوا تھا جس پر انواع مثلث اور دارے کا حوالہ تھا۔ اس لئے یہی سوچا جاسکتا ہے کہ دوسروی پارٹی بھی اس معاملے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتی ہے۔“

”اوہ.... آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ابھی اُسی۔ پی صاحب سے کس مسئلے پر گفتگو ہوئی تھی۔“

”انہوں نے اُس عمارت کی گمراہی شروع کر رکھی ہے جہاں تم لے جائے گئے تھے۔ وہاں شائد انہیں کچھ ایسے آدمی نظر آئے تھے جو انگلیوں کے نشانات تلاش کر کے اُن کی تصویری لے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہاتھ نہ آسکے ہوں گے اس لئے اُن کے متعلق مجھ سے پوچھا گیا تھا۔“

”وہ کون تھے۔“

”بیک فورس کے فنگر پرنٹ سکشن کے کچھ ماہرین۔“

”اوہ تو اس فورس میں مختلف قسم کے ماہرین بھی موجود ہیں۔“

”سیکوں نہیں۔“

”میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ میں کیا تاسکوں گا۔ تم بتاؤ کہ اندر کون ہے۔“

”تین ملٹری آفیسر۔ میرا خیال ہے کہ تمیوں کرٹل ہیں۔ وہ ایک آرمڈ کار میں آئے تھے۔ ان کے داخلے کے بعد کرٹل نے ہولڈر میں سرخ بلب لگوادیا۔ سنتریوں بنے ایس۔ پی صاحب تک کو اندر نہیں جانے دیا۔ اپنا سامنہ لے کر رہا گئے۔“

جید نے اس شدت سے دل کھول کر پاپ کا کش لیا کہ پہلے ہی جھٹکے میں کھانیوں کا دورہ پڑ گیا۔

لچک پ اطلاع

کچھ دیر تک وہ کینٹین میں ٹھبرا اور پھر اس ارادے سے اٹھ گیا کہ اگر اب بھی داخلہ ممکن نہ ہو تو یہاں تکھیاں مارنے کے لئے ہر گزندہ ٹھبرے گا۔

اب بھی سرخ بلب روشن تھا اور فتر کے دروازے پر دونوں سنتری گلگینیں لگی ہوئی رانقلیں سنjalے ایسہ ایس تھے۔

جید نے اپنی گاڑی سنجھا اور نکل بھاگا۔ شہر آکر ایک پلک ٹیلی فون بوتح سے فریدی کے نمبر ڈائیل کئے۔ دوسرا طرف فوراً ایک کال ریسیور کی گئی۔ بولنے والا خود فریدی تھا۔

”وہاں تو لال حق نظر آرہی ہے۔“ جید نے کہا۔ ”کہنے تو اب میں بگلے میں گھنٹی لٹکا کر کسی دوسرا ریلوے لائن پر دوڑنا شروع کر دوں۔“

”جہاں بھی رہو مجھے باخبر رکھنا۔“ دوسرا طرف سے کہا گیا۔

”فی الحال... میں قاسم تک جا رہا ہوں.... اُس کے نمبر نوٹ کیجھ۔“ جید نے قاسم کے فون نمبر دہراتے اور دوسرا طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

وہ سوچ میں ڈوبا ہوا پھر گاڑی میں آبیٹا۔ یک بیک اُسے وہ زخمی لڑکی یاد آئی جسے انہوں نے پچھلی رات پولیس ہسپتال میں داخل کر لیا تھا۔ کیا وہ اب بھی وہیں ہو گی یا بیان کی تبدیلی کے بعد اُسے حوالات میں بھیج دیا گیا ہوگا۔ کیوں نہ اُس کے متعلق بھی معلومات حاصل ہی کر لی جائیں۔ وہ پولیس ہسپتال پہنچ کر سید حافظ انصاری کے کمرے میں چلا گیا۔

”میں اس پر عش عش کے بغیر نہ رہتا۔ مگر اب بہت زور ہے نیند آرہی ہے۔“ جید نے کہہ کر جماں لی۔

”اگر اس کی انگلیوں کے نشانات مل گے تو یہ کیس سو فیصد ہمارا ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”جہنم میں گیا کیس۔ آپ تو اس انداز میں کہہ رہے ہیں جیسے یہ دو لاکھ کی رقم ہماری ہی ہو گی۔“

”نظہ نظر کا فرق ہے۔ کسی کیس کا بہتر اختام میرے لئے دو ہزار لاکھ کی رقم سے بھی زیادہ دلکش اور شفیع بخشن ہوتا ہے۔“

”میں تو چلا۔“ جید اٹھ گیا۔ ”فریدی نے اُسے روکا نہیں.... اور اُس کے انداز سے یہ نہیں ظاہر ہو رہا تھا کہ خود بھی اٹھنے کا رادا برکھتا ہو۔“

دوسری صبح جید دیرے سے بیدار ہوا۔ فریدی آفس جا چکا تھا۔ پہنچنے والے پچھلی رات سویا بھی تھا یا نہیں کوئی نکلے لا بھر ری میں۔ تو ایسے ہی آثار نظر آئے تھے جیسے وہ رات بھر بیٹھا رہا ہو۔ ایش ٹرے سگار کی راکھ اور متعدد ملے ہوئے ٹکڑوں سے بھرا ہوا نظر آیا تھا۔

تقریباً ساری ٹھیکارے گیا رہے جید نے بھی آفس کی راہ لی۔ لیکن یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ فریدی کے آفس کے دروازے کے اوپر سرخ بلب روشن تھا اور دو سلی سنتری باہر پھر دے رہے تھے۔ لیکن یہ فونجی تھے جید کے ملکے سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ وہ چکر اگیا۔ فریدی کے آفس کے دروازے پر سرخ بلب ہی چکرا دینے کے لئے کم نہیں تھا۔ پھر ملکے فوجیوں کی موجودگی۔

اُسے آفس کے اندر جانے سے روک دیا گیا اور اُس نے جلاہت میں کینٹین کی راہ لی۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس برآمدے میں داخلہ منوع تھا جس میں فریدی کا آفس تھا۔ کیونکہ اُسی برآمدے کے دوسرے کمروں کا عملہ بھی نہیں موجود تھا۔

لیڈی انسپکٹر ریکھانے اُس سے پوچھا۔ ”کیا تم بھی اندر نہیں جا سکتے۔“

”میں آج کل آٹھ ڈور ڈیوٹی پر ہوں۔“ جید نے لاپرواٹی سے کہا اور پاپ کمال کر اُس میں تباکو بھرتا ہوا ایک خالی میز کے قریب بیٹھ گیا۔ ریکھا بھی دیہن جم گئی۔

”کیا قصہ ہے۔“ اس نے رازدارانہ لمحے میں پوچھا۔ ”میں نے آج تک آئی۔ جی صاحب کے دفتر کے علاوہ اور کہیں بھی سرخ بلب نہیں دیکھا۔“

”تم اس کی ملازمت میں کیسے آئی تھیں۔“

”بن ستارے خراب تھے۔“ لڑکی نے سندھی سانس لی۔ ”مجھے وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ

دوسرے حکم آیا کہ اُنے ابھی ہپتال ہی میں رکھا جائے۔ وہ روم نمبر نامیں میں ہے، آپ اُس سے

”صرف واقعات بیان کرو۔“ حمید نے کلائی کی گھری پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں بے روز گار تھی اور اُس دن اسی غرض سے ”دفتر روزگار“ کی طرف گئی تھی کہ شائد

کہیں کوئی مناسب ملازمت مل جائے لیکن مایوسی ہی ہوئی۔ میں واپسی کے لئے تیار ہی تھی کہ ایک

شریف آدمی نے مجھے آفر دیا۔ وہ مجھ سے کسی خوبی لائبریری کی دیکھ بھالی کرانا چاہتا تھا۔ معقول

مادھے پر میں تیار ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ وہ لائبریری اسی عمارت میں ہے جہاں میں کرنل کو

لے گئی تھی۔ لیکن یہ بات قطعی غلط تھی کہ اس کا تعلق نصیری نام کے کسی آدمی سے تھا۔

”پھر وہ عمارت کس کی تھی؟“

”خدا ہی جانے۔ وہیں ایک کمرے میں میری رہائش کا انظام بھی تھا۔ کبھی کبھی کچھ لوگ وہاں

آیا کرتے تھے جن کے ناموں سے میں واقع تھی۔ لیکن وہ کسی باس کا تذکرہ بڑی شدید سے کیا

کرتے تھے اور مجھے اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی تھی کہ میں بھی اسی باس کی ملازمت ہوں۔

آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اچھے ہاتھوں میں نہیں پڑی ہوں۔ پھر دچار بار باس کے

بھی درشن ہوئے اور پچھلے دن اُس نے مجھے اس کام پر اسلامیہ میں کسی نصیری سے بھی واقع نہیں

تھی۔ میں نے کرنل سے جو کچھ بھی کہا تھا اُسی نے کہلوایا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کرنل سے

صرف نہ اق کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کرنل اس کے دیرینہ و دستوں میں سے ہیں۔“

”چلو میں سے تعلیم کرتا ہوں۔ لیکن تم اتنی زیادہ غائب کیوں تھیں۔ تمہیں کیسے خیال ہوا

کہ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”میں نے خود اسے کہتے ساختا۔ اُس نے اپنے آدمیوں میں سے کسی کو حکم دیا تھا کہ وہ مجھے

جہاں بھی دیکھے شوٹ کر دے۔“

”اوہ.... پچھلی رات میں چھپ کر اُس عمارت میں پہنچی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ انہوں

نے کرنل کو ہکار کر کے ایک تھیلے میں ٹھوں دیا ہے اور انہیں کہتا لے جا رہے ہیں تو میں نے

ایک چیکی میں بیٹھ کر ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور خود بھی اُسی عمارت میں جا پہنچا۔ لیکن ان

”وہ سیکل ہے کیپشن....!“ انجارج نے کہا۔ ”رپورٹ کے مطابق پچھلی رات آپ کے

کے ایس۔ پی صاحب نے اُسے حوالات میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کئے تھے آج تک

دوسرے حکم آیا کہ اُنے ابھی ہپتال ہی میں رکھا جائے۔ وہ روم نمبر نامیں میں ہے، آپ اُس سے

سکیں گے۔“

”شکریہ....!“ حمید احتراہ ہوا بولा۔

”روم نمبر نامیں میں لڑکی تھا نہیں تھی۔ وہ زیس بھی موجود تھیں اور وہ شائد کیپشن حمید

پہچانتی بھی تھیں کیونکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ اس انداز میں مسکرائی تھیں جیسے وہاں حمید کی

آمد ان کے لئے کوئی خاص معنی رکھتی ہو۔“

پھر وہ کمرے میں چلی گئی تھیں۔ لڑکی اٹھ کر تھکنے کے سہارے بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”ایسا محصور

ہوتا ہے جیسے میں نے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھا ہو۔“

”میں بھی بھی سوچ رہا ہوں۔“ حمید کری کھیچ کر بتر کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”اوہ....!“ یک لڑکی کی آنکھوں میں خوف کی جھلکیاں نظر آئیں اور وہ بھرائی ہوئی

آواز میں بولی۔ ”یاد آیا پچھلی رات آپ ہی کرنل فریدی کے ساتھ تھے۔“

”ٹھیک یاد آیا۔“ حمید نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔“

”کیا تم باہر جانا چاہتی ہو۔“

”نہیں.... ہرگز نہیں۔ میں اس کے متعلق سوچ بھی نہیں لکھتی۔“

”تو پھر کیا ہم تمہیں اپال کر کھائیں گے۔“

”وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔“

”لیکن وہ ہے کون؟“

”کوئی نہیں جانتا۔ نام سے بھی کوئی واقع نہیں ہے۔ وہ صرف باس کہلاتا ہے۔“

”اب کہاں مل سکے گا۔“

”کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب اور کہاں ملے گا۔ حسب ضرورت وہ خود ہی اپنے ملازموں کو

کال کرتا ہے۔“

”ناگن ہر حال میں زہریلی ہوتی ہے۔ عورت ناگن ہی کھلاتی ہے نا۔“

”وہ صرف بدھوؤں کے لئے ہی ناگن ہو سکتی ہے ہمارے لئے نہیں۔“

”میں زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کر سکتی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“

حمدید کچھ کہنے بغیر اٹھ گیا۔ لیکن جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”سننے تو ٹھہری۔“

”وقت نہیں ہے۔“ حمدید نے مڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور نکلا چلا آیا۔

یہاں کافی وقت صرف ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے اس دوزان میں فریدی نے قاسم

کے فون پر اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہو۔ پولیس ہسپتال تو وہ بلا قصد آیا تھا۔

انچارج کے کرے سے اس نے فریدی کو فون کیا۔

”تم کہاں سے بول رہے ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”سوں ہسپتال سے۔“

”لیکن تم نے مجھے قاسم کے نمبر دیتے تھے۔“ فریدی کی آواز غصیلی تھی۔

”بن اوہ ز بھی چلا آیا تھا۔“

”خواہ خواہ وقت بردا کرتے پھر رہے ہو۔ اب فوراً گھر پہنچو۔ میں آرہا ہوں۔“

حمدید خود بھی چاہتا تھا کہ فریدی سے جدل مل سکے۔ کیونکہ وہ ملڑی آفیسروں کی آمد کے

متعلق ایجنٹ میں بنتا ہو گیا تھا۔ ویسے ان کی آمد یقین طور پر کسی کار خاص ہی کے تحت ہوئی تھی۔

ورنہ دروازے پر سرخ بلب کیوں روشن کیا جاتا۔ سرخ بلب کا مطلب یہی تھا کہ اندر کوئی بہت سی

کو فرید نسل قسم کا کام ہو رہا ہے۔ اس لئے اس طرف کسی کو بھی نہ آنے دیا جائے۔

لیکن کیا وہ کو فرید نسل قسم اسی قسم کا تھا کہ مجھے کا ایس۔ پی۔ بھی فریدی کے آفس میں نہ داخل

ہو سکے۔ حمدید جانتا تھا کہ فریدی بعض امور میں اپنے مجھے کے اعلیٰ افسروں کو بھی جواب دہ نہیں تھا۔

کیا یہ میں الاؤای ہی قسم کا کوئی امر تھا جس کیلئے اس کے آنے کے دروازے پر سرخ بلب لکھا گیا تھا؟

گھر پہنچ کر اس نے فریدی کو اپنا منتظر بیا۔

”تم پولیس ہسپتال کیوں گئے تھے۔“ اس نے اُسے گھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ بھی نہیں کرتے۔“ حمدید نے لاپرواٹی سے کہا۔

لوگوں کی نظروں سے بچنی ہی رہی تھی۔ ایک کمرے میں چھپ کر میں نے اُس کی مایوسی دیکھی تھی جب تھیلے سے کرٹل کی بجائے اُسی کا ایک آدمی برآمد ہوا تھا۔ پھر تم نے اُس پر کری کھٹکی مددی تھی اور اُس کے کسی آدمی نے میں سوچ آف کر کے اندر ہیرا کر دیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے کسی کو حکم دیا تھا کہ مجھے جہاں بھی دیکھے گوئی مار دے۔“

”لیکن بازو کا یہ زخم۔“ حمدید نے اُسے ٹوٹنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ پتہ نہیں کیا چیز لگی۔ مجھے اندازہ نہیں! ہوش ہی نہیں تھا۔“

”ہوش تو جھیمیں کبھی نہیں رہا۔“ حمدید سکریا۔ ”مثال کے طور پر تم نے اپنا پہلا بیان بھی بیوہ شی ہی کی حالت میں دیا تھا۔ اسی لئے ہوش آنے پر بیان بدلا پڑا۔“

”یقیناً میں اسی حد تک نہ سوچ تھی کہ مجھ سے بے ٹکنی حرکتیں تسریز دہوں۔“

”اُسی تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے بھی لکھوایا بھی ہو گا۔“

”پھر کیا کرتی۔“

”تو تم اُس وقت حقیقتاً بیوہ ش نہیں تھیں تھیں جب ہم تمہارے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔“

”میں بیوہ ش نہیں تھی لیکن اتنی خوفزدہ تھی کہ آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔“

”لیکن تم نے بیان بندیں کرنے کی ضرورت کیوں غخوں کی۔ جب کہ کرٹل غلط بیان دے چکے تھے۔ ظاہر ہے اس نے اُن کی مشاہدی تھی کہ تم جیل کی چارا دیواری سے دور رہو۔“

”میں مرنا نہیں چاہتی۔“

”لیکن تم نے یہ نہیں سناتھا کہ انہوں نے جھیں اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔“

”ضروری نہیں کہ وہ میری حفاظت بھی کر سکتے۔“

”تو تم جیل جانے کے لئے تیار ہو۔“

”اُسی لئے میں نے بیان تبدیل کیا ہے۔“

”سات سال سے کم کے لئے نہیں جاؤ گی۔“

”اب جو کچھ بھی ہو۔“

”بیوہ تو فہلانے کی کوشش نہ کرو۔ کسی قسم کا زہر اب بھی تمہارے وہن میں موجود تھے۔“

”واللہ بہت خطرہ ک آدمی ہے۔ میں اُس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ اب یاد آ رہا ہے۔“ حیدر نے کہا۔ ”دور ان جنگ کی بہتری با تسلی میرے ذہن سے محظی ہیں خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ رہی ہوں۔ حاذجگ ایسی ہی چیز ہوتی ہے۔“

”مجھے علم ہے کہ وہ انہاتی بے رحم اور سفاک آدمی ہے۔“ فریدی مسکر لیا۔ ”زندگی اور موت دونوں ہی کو کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔“

”لیکن پچھلی رات وہ کیا چاہتا تھا۔“

”صرف سننی پھیلانا چاہتا تھا اور کچھ نہیں۔ اُسے لکھ لو کہ وہ میری معلومات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ میں تیزی سے کام شروع کر دوں۔ کاش مجھے معلوم ہو سکا ہوتا کہ ملٹری سیکرٹ سروس والوں نے اُس کی انگلیوں کے نشانات کہاں پائے تھے یقیناً وہ کوئی بہت ہی اہم جگہ ہو گی۔“

”تو پھر اب یہ کیس گیا آپ کے ہاتھ سے۔“

”اب ہی تو میرے ہاتھوں میں باقاعدہ طور پر آیا ہے۔“

”پھر انہوں نے آپ کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ واللہ ہی انگلیوں کے نشانات کہاں ملے تھے۔“

”میں ڈاکٹر داؤد والے کیس کی بات کر رہا ہوں۔ چونکہ خیال ہے کہ اُس کے قتل کا ذمہ دار واللہ ہی۔ اس لئے اس کی تقاضی صرف میں ہی کروں گا۔“

”دفعہ فون کی گھنٹی بھی اور فریدی نے رسیور اٹھایا۔ ”ہیلو۔“

”کون ہے؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”فریدی۔“

”مبادرک باد قبول کرو کر غل۔“

”کس سلسلے میں؟ تم کون ہو۔“

”میجر واللہ۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں بھی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر داؤد والا کس باقاعدہ طور پر تمہیں سونپ دیا جائے۔“

”غیری۔“ فریدی نے خنک لیجھ میں کہا اور فون سے لگے ہوئے ایک آئے کاٹن دباتا ہوا بولا۔ ”لیکن میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم ایسا کیوں چاہتے تھے۔“

”قلعی نہیں۔ اگر مجھے اپنے آفیسر سے اس کے متعلق کوئی ہدایت نہ ملی ہوتی۔“

”وہ دن بھی دور نہیں جب میرا اپنا الگ آفس ہو گا اور اُس کے دروازے پر آپ کے لئے لال جہنمذی لگلی ہو گی۔“

”اوہ....!“ فریدی نے سکار کیس نکال کر اُس کا گوشہ توڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اُس۔ پی صاحب کو خفت اٹھانی پڑی۔ میں نے انہیں پچھلی رات ہی آگاہ کر دیا تھا۔“

”کیا یہ سرخ بلب اسی لئے لگایا گیا تھا۔“

”ہاں! معاملات الجھر ہے ہیں۔ اُس عمارت سے کچھ ایسے نشانات ملے ہیں جو میجر واللہ کی انگلیوں کے نشانات سے مطابقت رکھتے ہیں۔“

”تب پھر معاملات سمجھ رہے ہیں یا الجھر ہے ہیں۔“

” الجھر ہے ہیں۔“ فریدی نے سکار سلاکا کر کہا۔ ”آن صحیح میں نے میجر واللہ کے سلسلے میں ملٹری کی سیکرٹ سروس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ لہذا اتنی آفسر اس کا نام سختی ہیاں دوڑے آئے۔“

”کیوں؟ کیا انہیں بھی یہاں اُس کی موجودگی کا علم ہے۔“

”ہاں! لیکن وہ اُس کے متعلق شے میں جلا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں دھوکا ہوا ہے۔“

”آخر کس بناء پر۔“

”ایک جگہ سے انہیں کچھ نشانات ملے تھے، جو اُس کی انگلیوں کے نشانات سے مطابقت رکھتے تھے۔ ابھی وہ ماہرین کے مشاہدے میں ہی تھے کہ میرا پیغام پہنچا۔“

”کیا یہ مجھے نہیں بتایا جائے گا کہ نشانات کہاں ملے تھے۔“

”خود مجھے ہی نہیں بتایا گیا میں تمہیں کیا بتاؤں۔“

”لیکن وہ آئے کیوں تھے۔“

”اُن میں سے ایک فنگر پر نش کا ماہر تھا اور مجھ سے اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا تھا میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ وہ میجر واللہ ہی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“

”اوہ تو کیا اب وہ اُس لڑکی سے بھی سوالات کریں گے۔“

”یعنی طور پر اوہ اُسے لے جائیں گے۔ ہر ایک کا طریق کار الگ ہوتا ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ واللہ کا حربہ خود اُسی پر آزماتا لیکن لڑکی نے بیان تبدیل کر کے کھیل بگاڑ دیا۔“

لے کچھ منمارہا پھر ماڈ تجھ میں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”جو کوئی بھی ہے صرف آپ ہی سے لگتگو کرنا پتا ہے۔“

فریدی نے ہاتھ بڑھا کر رسیور لے لیا۔

”ہیلو... فریدی اسپیکل...!“
وہ تھوڑی دیر تک کچھ منمارہا پھر بیساخہ ہن پڑا... دیے حمید نے اس کی آنکھوں میں تحریک بھی بلکل سی لمبہ دیکھی۔

”مگر بھی! میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ کہو تو یونی تقریباً چلا آؤں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ پاگل ہے اور کسی نے اس سے یہ دلچسپ مذاق کیا ہے... اچھا... اچھا...!“
اس نے سلسلہ منقطع کر کے حید کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں مسکراہیں رقص کر رہی تھیں۔
”کہو تو یہ کیس تھیں دلوادیا جائے۔“ اس نے کہا۔

”کون سا سکس...!“
”پروفیسر غوری نے شتر مرغ کی بجائے آدمی کا پچہ دیا ہے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔
”میں نہیں سمجھا۔“

”پروفیسر غوری کا نام سنایا ہے کبھی۔“
”ہاں ساتو ہے شاندے۔“ حمید ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”وہی تو نہیں جو کہتا ہے کہ جراشیم کی طرح بڑے حیوانات بھی پیدا کئے جاسکتے ہیں۔“
”ہاں وہی!“ اس نے اس بار اعلان کیا تھا کہ وہ عقربی ایک مصنوعی اٹھے سے شتر مرغ کا پچہ پیدا کرنے گا۔ آج اٹھہ ٹکست ہونے کا دن تھا۔ اس نے اپنے بھتیرے دوست حکام کو تجربہ میں مد عکیا تھا۔ لیکن اٹھہ سینے والی مشین سے آدمی کا پچہ نکل پڑا اور وہ بھی اس دل گردے کا ک پیدا ہوتے ہی اپنے خالق کی کھوپڑی پر ایک چیت رسید کر دی۔ فون پر کو تو ای کا انچارج تھا اور یہ اس کا آنکھوں دیکھا حال تھا۔

”وجہ بھی تمہیں معلوم ہے۔“ دوسری طرف سے ہلکے سے تجھے کے ساتھ کہا گیا۔
”لیکن سنو! میرا نام بھی فریدی ہے۔“

”تھی دیکھنا ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔
اُس کی تقدیر ہی کی۔ جہاں تھا اظہران سے وہیں بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدی تجھے خانے میں اپنے نجی آٹو میک ایکس چنج پر وہ نمبر معلوم کرنے گیا تھا جس سے کسی نے اُسے مخاطب کیا تھا۔ فون بے لگے ہوئے آئے کامن دبائے کا مقصد تھی تھا کہ تجھے خانے کا ایکس چنج دوسری طرف کے نمبر ظاہر کر دے۔“

کچھ دیر بعد واپس آگیا۔ لیکن حمید نے اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھئے۔
”کیوں؟ کیا بات ہے۔“ اس نے پوچھا۔
”فون کا تعلق سرکاری ایکس چنج سے نہیں معلوم ہوتا۔“ فریدی نے جھلانے ہوئے بچہ میں کہا۔

”تجھا کون...؟“
”میجر والٹن۔“
”نہیں....!“ حمید اچھل پڑا۔
”ہاں اس نے مجھے مبارک باد دی تھی۔“ فریدی مسکرا یا۔ ”اس خوشی میں کہ ڈاکٹر داؤڈ کا کیس باضابطہ طور پر مجھے مل گیا ہے۔“

”کمال ہے! کس دل گردے کا آدمی ہے۔“
”وہ ایسا ہی ہے اور یہی اس کا مخصوص حربہ ہے جس سے وہ دوسروں کو نزدوس کر دیتا ہے۔“
”تو پھر اسے اس کا بھی علم ہو گا کہ سیکرٹ سروس والے آپ کے پاس کیوں آئے تھے۔“
”اگر نہیں ہے تو پھر یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیس باضابطہ طور پر میرے پاس آگیا ہے۔“

”تب تو لو ہے لگ جائیں گے جتاب۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔
”فریدی کی کچھ نہ بولوں وہ کسی تھری سوچ میں تھا اور اس کی پیشانی پر سلوشن اپھر آئیں۔“
یک بیک فون کی گھنٹی پھر بجی اور فریدی نے حمید کو کال رسیور کرنے کا اشارہ کیا۔ حمید چند

”اویں سے۔“
”تریف لایے جناب۔“ وہ چاٹک کھل جانے پر ایک طرف ہتھی ہوئی بولی۔

”اوہ.... میں تو سمجھتا تھا کہ یہاں بہت بھیز ہو گی۔“ حمید نے پائیں باغ میں داخل ہو کر

چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تھی! اب نہیں ہے۔ آئیے تریف لایے۔ کیا یہ باغ آپ کو پسند آیا۔ ہم نے یہاں

بزرگ کی بچیں ڈالوائی ہیں۔ ان پر بیٹھئے تو بس ایسا ہی لگتا ہے جیسے بزرے پر بیٹھے ہوں۔“

”یقیناً.... یقیناً....“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”آئیے تو پھر بیٹھیں۔“ اُس نے کچھ دور چل کر لان پر پڑی ہوئی ایک نیکی کی طرف اشارہ کیا۔

”جی ہاں.... جی ہاں.... مگر....!“

”مگر.... اور لیکن ہمیشہ الجھن ہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے ایسے فضول الفاظ سے دلچسپی نہیں ہے۔ بیٹھئے۔“

حید بوكھلائے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ لڑکی نے بہر حال اُسے متاثر کیا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دروڑاں جو پر سکون ماحول تھا۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے چاروں اطراف میں باغ کا چھیلاؤ اُسے پر ٹکھوٹھو بنائے ہوئے تھا۔ غالباً اسی عمارت کے کسی گوشے میں پروفیسر کی رہائش بھی تھی کیونکہ ایک جگہ ایک مختصر سی چمنی سے دھوان نکل رہا تھا اور یہ چمنی کچن ہی سے متعلق معلوم ہوتی تھی۔

”مجھے پروفیسر سے ملتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”مجھ سے ملتے۔ پروفیسر میں کیا رکھا ہے۔“ لڑکی نے بڑی سمجھی گی سے کہا۔

”میں نہیں سمجھا۔ آپ کون ہیں؟“

”یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتی ہوں۔“

”میں ملکہ سراج رسانی کا ایک آفیسر ہوں۔“ حمید نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف

دھراتے ہوئے کہا۔

لڑکی چند لمحے حریت سے اسے دیکھتی رہی پھر مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں تو آپ

نئھا قدمتے

پروفیسر غوری کی تجربہ گاہ شہر سے پدرہ میں دور جھرمی کے علاقے میں واقع تھی۔ یہاں صرف یہی ایک تجربہ گاہ تھی۔ میں میں کے رتبے میں متعدد تجربے گاہوں کی مختلف النوع عمارتیں کھڑی تھیں۔ ایک آدھ کی حیثیت فوجی اور سرکاری بھی تھی جہاں فوجی نعمت کے تجربات ہوتے تھے۔ اس حصے میں داخلہ منوع تھا۔

تقریباً اچھے کیمپن حمید کی کارڈ اکٹھ غوری کی تجربہ گاہ کے سامنے رکی۔ وہ تنہ آیا تھا۔

چاٹک بند نظر آیا۔ دوسری طرف ایک خونخوار قسم کا پوکیدار موجود تھا۔ وہ ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”جاوہا بابا.... صاحب! اتنا پڑا ہے نہیں ملیں گا۔“

”پولیس....!“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”جاوہا۔ تم اخبار والا ہے۔ ہم سمجھتا۔ صاحب بولا اخبار والاں کو گولی نہارو۔“

حمد نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا لیکن چوکیدار نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے لاپرواں سے کہا۔ ”نہیں چلیں گا۔“

”اے بد تمیز....!“ اچاٹک کمپاؤٹر کے گوشے سے ایک بڑی سریلی آواز آئی۔ کیوں نہیں کھوٹا چاٹک۔ بڑے آدمیوں کو پیچانا سکے۔“

”اخبار والا.... بی بی جی۔“ چوکیدار بھرا ہی ہوئی آواز میں بولا۔

استئنے میں بولنے والی بھی حید کو نظر آگئی۔ نظر کیا آئی نظروں میں ساکر سید ہمی دل میں اترتی چلی گئی۔ عمر اٹھا دیا انس سے زیادہ نہ رہی ہو گی۔ وہ پتلون اور جینکٹ میں ملبوس تھی۔ اخزوٹ کی رنگت کے گھوٹکھریا لے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ خدوخال کا اندازہ تو اس وقت ہوتا جب تصلی جائزے کے لئے ایک بار بھی نظر اس کے چہرے پر ٹھہر سکی ہوتی۔

وہ چاٹک کے قریب آگئی تھی۔ حید نے پلکیں جھپکائیں کچھ کہنے کے لئے ہوت کھولے لیکن پھر خاموش ہی رہا۔

”چاٹک کھلو.....!“ لڑکی نے تحکمانہ لمحے میں کہا۔

”آپ جانوبی بی بی۔“ چوکیدار چاٹک کھوٹا ہوا بڑا بڑا۔ ”صاحب بڑا غار کھاتا پڑا ہے اخبار

نہایت اطمینان سے پاپ میں تمباکو بھر رہا تھا اور انداز ایسا تھا جیسے قاسم اُس کے لئے اجنبی ہی ہو۔
لڑکی اُسے بھی ساتھ لے کر اسی نیچ کی طرف پلٹ آئی۔

”ان سے ملنے۔“ اُس نے کہا۔
”مل چکا ہوں۔“ قاسم کی آواز غصیل تھی۔

”تو پھر شاکنڈ آپ دونوں کے تعلقات بہتر نہیں۔“
”مکھد اجانے۔“ اس بار قاسم مردہ سی آواز میں بولا تھا۔

”مجھے پروفسر نے ملا ہے مختار مہ۔“ حمید نے کہا۔
”آپ انجمن کے محض بیس میں نہیں چاہتی کہ آپ مر جانے کی حد تک بور ہو جائیں۔“
”انجمن کے محض۔“ قاسم نے جرت سے پلکس بھچا میں۔

”جی ہاں! انہوں نے ایک سوچاپس روپے عنایت فرمائے ہیں۔“
”واپس...!“ قاسم تھوک نگل کر بولا۔ ”واپس قریب تھے۔“
”قیون؟“ لڑکی نے اسی کے سے انداز میں پوچھا۔

”انجمن سالی کا کابڑا ہو جائے گا۔“
”کیا مجھے بغیر اجازت ہی عمارت میں گھنٹا پڑے گا۔“ حمید نے سخت لمحہ میں کہا۔
لڑکی جواب میں کچھ کہنے ہی دالی تھی کہ عمارت کے اندر سے پے درپے چیزوں کی آوازیں
آئیں اور ایک آدمی دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ پھر برآمدے کے زینوں پر گر کر لا ہلتا ہوا نیچے آگرا
ڈیڈی۔“ لڑکی چیختی ہوئی اس کی طرف چھپی۔

وہ یحیم خیم آدمی منہ کے بل گرا تھا۔ جیامت میں قاسم جیسے دیو پیکر سے کچھ ہی کم رہا ہو گا۔
اس نے دوبارہ انھنے میں شاکنڈ اسے دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بیک وہ سر اٹھا کر دھاڑا۔ ”وہ
اندر موجود ہے۔“

”کون....ڈیڈی...کون۔“ لڑکی جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش کر کر ہی بولی۔
”وہی....دھی لڑکا....!“ اس کا ڈیڈی نری طرح ہاتپ رہا تھا۔ قاسم اور حمید بخشکل اسے
زمیں سے اٹھانے میں کامیاب ہو سکے۔
”اوہ ڈیڈی....وہم ہے آپ کا.... اسے بھول جائے۔ خدا نے چاہا تو کبی آپ شتر مرغ

کو کوئی شریف آدمی سمجھی تھی۔ مگر خیر... نہ سمجھ رہے۔
اس نے اپنا پرس کھول کر ایک کاپی نکالی اور اس کے اوراق اٹ کر ایک صفحے پر حمید کا
لکھتی ہوئی بولی۔ ”میں آپ کو اس کا موقع ضرور دوں گی کہ آپ خود کو ایک شریف آدمی ناپڑ
کر سکیں۔“

یہ کسی قسم کی رسید بک تھی۔ نام لکھ کر رقم کے خانے میں اس نے مبلغ پچاپس روپے کے
اور درق پھاڑ کر حمید کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”شرافت کا ثبوت دیجھے۔“
حمد نے بھنوں سکوڑیں اور آہستہ سے بولا۔ ”اوہ... انجمن ترقی خواتین کا چندہ۔“
”میں ہاں۔ مردوں کی بھلانی اسی میں ہے کہ خواتین ترقی کریں۔“ لڑکی تڑبے بولی۔
”آپ نے میری توہین کی ہے پچاپس کی رقم لکھ کر۔“ حمید نے بڑا سامنہ بنایا۔
”پھر فرمائیے۔“

”کم از کم ایک سوچاپس۔“ حمید نے کہا۔ اس وقت وہ بالکل گاؤڈی نظر آنے لگا تھا۔
”اوہ... آپ تو شریف الشرفاء ثابت ہو رہے ہیں لایے۔“
لڑکی نے رسید پر پچاپس کے ایک سوچاپس بنائے۔ حمید نے پر سے نوٹ نکال کر گن
دیئے اور بولا۔ ”آپ پروفیسر سے ملا دیجھے۔“

”آپ بور ہو کر مر جائیں گے اگر انہوں نے اپنیل کے انٹے سے بھینس کا پچہ نکالا شروع
کر دیا۔“

”آن سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔“
”باپ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ اوہ ہو...!“ وہ یہکی کھڑی ہو گئی۔ ”اوہ ہمارے
سر پرست صاحب بھی آگئے۔“ اور پھر زور سے چھپی۔ ”جو کیدار پھانک کھوں دو۔“
لیکن سر پرست پر نظر پڑتے ہی حمید کی کھوپڑی ہوا سے باٹیں کرنے لگی۔ وہ کبھی سر پرست
کی جانب دیکھتا تھا اور کبھی لڑکی کی طرف۔ لیکن یہ کبھی میں نہ آسکا کہ وہ سر پرست کس قسم کی تھی۔
سر پرست کار سے اتر کر کمپاؤٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر حمید پر پڑی جہاں تک دیں
رک گیا۔ بھاڑا سامنہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ یہ قاسم تھا۔
”آئیے... آئیے جتاب۔“ لڑکی نے آگے بڑھ کر پراشتیاق لمحہ میں کہا۔ حمید بیٹھا ہی رہا۔

”چلے امیں چلتا ہوں۔“

”مم... میں۔“ پروفیسر غوری خوفزدہ انداز میں ہکایا۔ ”میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔“

”چلے میں چلتی ہوں۔“ لڑکی آگے بڑھتی ہوئی یوں۔

”ارے نہیں... تم نہیں... سارے... میری بات سنو۔“

لیکن لڑکی حمید کا تھک پکڑے زینوں پر چڑھتی چلی گئی۔

”میں بھی ٹاؤں!...!“ قاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ حمید نے پوچھا۔

”پروفیسر بہت زیادہ خائف ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”خداجانے امیں نے دیکھا نہیں! صرف ناہے۔ لیکن انہیں جھونا بھی نہیں سمجھ سکتی۔“

”خواب گاہ کدھر ہے۔“

وہ عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ لڑکی نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے

دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی مسہری پر کوئی چادر اوڑھے پڑا تھا۔

لڑکی دروازے ہی پر ٹھنکت گئی اور از مژ کر حمید کی طرف دیکھا۔

حمدی نے آگے بڑھ کر چادر انھائی اور پھر چھوڑ دی جو سونے والے کے سینے پر گری۔ چہرہ

لاش کی طرح سفید تھا اور وہ حقیقت لاش ہی معلوم ہو رہی تھی۔ کسی بچ کی لاش۔

”یہ تو مر چکا ہے۔“ حمید نے تحریرانہ لجھ میں کہا۔

”مر گیا... اودا... میرے خدا... کتنا سفید ہے۔“

وقتاً لاش کے ہومنٹ ہلے اور ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔ حمید

اچھل کر پیچھے ہٹ آیا لیکن اس کے باوجود بھی اس نہ بڑھنے پچے کی لاث اس کے سینے ہی پر چڑھی۔

حمدی لڑکھڑا کر دیوار سے جا گکرایا۔ بس ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے بجلی ہی چک گئی ہو! پھر لڑکی بھی

یقین کے ساتھ نہ بتا سکی کہ وہ چھلانگ لگا کر روشنданے سے نکل گیا تھا اور دروازے سے گذر اتھا۔

حمدی جھلانہت میں ریو اور نکال کر دروازے کی طرف چھپتا۔ لڑکی اُن کے پیچے دوڑ رہی

تھی۔ پھر انہوں نے عمارت کا گوشہ گوشہ چھان ناہر لیکن اس کی پر چھائیں تک نہ دکھائی دی۔

کچھ دیز بعده حمید نے قاسم کی آواز سنی جو دہراتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”ابے میں سب سمجھتا ہوں۔“

کے انٹے سے بکری کا بچہ نکال سکیں گے۔“ لڑکی نے اس کے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا... وہم ہے۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”ارے نصف درجن آدمیوں نے اسے دیکھا تھا اور میں انہیں ابھی دوبارہ دیکھ کر آرہا ہوں۔“

”افسوں میں کیوں نہ دیکھ سکی۔“

”تم اس وقت تھیں کہاں۔“

”کیا قصہ ہے جناب۔“ حمید نے پوچھا۔

اب پروفیسر غوری نے اسے گھوڑ کر دیکھا۔ ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے پہلی بار اس کی طرف دھیان دیا ہو۔

”تم کون ہو... پریس پورٹر۔“ اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”جی نہیں! میرا تعلق ملکہ سراج غرسانی سے ہے۔“

”قپچان حمید...!“ قاسم نے جلے کئے لہجے میں کہا۔

”اوہ... اچھا اچھا۔“ پروفیسر سر ہلا کر بولا۔ ”مگر آپ کیا کر سکیں گے۔ وہ تو چھلا دھے ہے بھوت ہے اپنے نہیں کیا ہوا شتر مرغ کی بجائے۔“

”آپ بھی تو ایک دم سے شتر مرغ لے دوڑے تھے ڈیڑی۔“ لڑکی نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ ”پہلے مرغی کے چوزے نکالے ہوتے۔“

”ہاں! اس غلطی ہو گئی۔“

”لتنا... برا بچہ تھا۔“ حمید نے تحریرانہ انداز میں پوچھا۔

”آف فہ...!“ پروفیسر پیشانی رکھتا ہوا بولا۔ ”بھج میں نہیں آتا کیا بتاؤں! وہ آٹھ یا وس سال کے بچے کے برابر ہو گا۔ جیسے ہی میں نے جھک کر میں کاڑھن کاٹھیا وہ بھج کی طرح تپا۔

پھر میری پیٹھ پر سوار ہو کر سر پر ہاتھ مارا۔ پیٹھ سے اچھل کر میرز پر پہنچا اور وہاں سے جو چھلانگ

اگلی ترو شندان سے باہر تھا۔ چھ آدمیوں نے دیکھا ہے۔ چھ آدمیوں نے... وہ سب معزز اور

اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ میرے لئے جھوٹ نہیں بولیں گے اُن سے ضرور پوچھئے۔“

”تو وہ پھر نظر آیا ہے۔“

”ہاں! میری خواب گاہ میں۔ میں بدقت تمام بھاگ سکا تھا۔“

”ایک بار میرے چچا جان کی بھی بد نصیبی ہو گئی تھی۔ ایک ساتھ پانچ بچے۔ پچی جان بالکل بولا۔“ ایک راہداری میں اُس سے مدد بھیڑ ہو گئی اور وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”یہ قابے قاچپر ڈھونڈا جا رہا ہے... خوب نئی کا... قیوں؟“

”کیوں بکواس کر رہے ہو۔“ حمید نے اُسے ڈالنا۔

”اے.... تو مچوپ راؤ۔“ قاسم بھی غرایا۔ ”قیاس جھوٹ کہہ رہا ہوں۔“

”آپ نہیں سمجھتے۔“ پروفیسر رو میں کہتا گیا۔ ”میں دراصل شتر مرغ کا پچہ نکالنا چاہتا تھا معنوی اٹھے سے۔“

”تو پھر قابے کی پریشانی ہے۔ شتر مرغ کا پچہ اُسے گا نہیں تو کیا پیدل چلے گا۔“ قاسم نے طریقہ لمحہ میں کہا۔

”اوه.... میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“ پروفیسر جھخلا کر بولا۔ ”شتر مرغ کی بجائے آدمی کا پچہ نکل آیا۔“

”اُسے باپ رے۔“ قاسم بوکھلا کر اپنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

حمید نے کچھ دیر بعد وہیں سے فریدی کو فون کیا اور اُسے حالات سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ وہاں رات بس رکھ سکتا ہے یا نہیں۔

اجازت مل گئی۔ سائزہ مطمئن نظر آنے لگتی تھی۔ وہ بجے تک قاسم بھی وہیں رہ۔ سائزہ نے اُسے بتایا کہ قاسم اتفاقاں کی انجمن کا سر پرست بن گیا تھا۔

”ہم لوگ اکثر بڑے ہو ٹلوں میں انجمن کے لئے چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔ بس یونہی لوگوں کی میزوں پر چلے گئے اور وصول کر لیا۔“ سائزہ نے کہا۔ ”ایک دن آر لکھو میں سر قاسم سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے تین ہزار کا چیک دیا۔ اس سے پہلے کبھی یکمشت اتنی بڑی رقم نہیں ملی تھی۔ ان حضرت سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ بالکل ہی کوڈن ہیں۔ دوسرا لڑکوں کی رانے ہوئی کہ انہیں مستقل طور پر انجمن کا سر پرست بنا لیا جائے۔ اب ہم انہیں لیڈر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگی اور حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”غیر اسے جانے دیجئے۔ اب آپ بھے پروفیسر اور ان کے تجربات کے متعلق کچھ بتائیے۔“

”ویڈی کریک ہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سائیلے کر کہا۔ ”بس اپنے کچھ سائندنڈ ان دوستوں کی ضد میں یہ سب کچھ کاٹھ کبڑا پھیلایا ہے۔ مفت میں میے برباد کر رہے ہیں۔ اوٹ پانگ کتابیں

اتنی دیر لگادی۔ سالے مجھے کہیں بھی جیسی نہ لینے دوئے۔“

ایک راہداری میں اُس سے مدد بھیڑ ہو گئی اور وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”یہ قابے قاچپر ڈھونڈا جا رہا ہے... خوب نئی کا... قیوں؟“

”مت بکواس کرو۔“ حمید کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔

”اچھا جی۔... یہ بات ہے۔“

حید اُسے دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ قاسم کسی کھنکھنے کتے کی طرح غریا تھا۔ لیکن اُسکی اس کی پیشہ تھکت ہوئی بولی تھی۔ ”خاہونے کی بات نہیں ہے جناب! ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔“

”ہے الا! اپنی ہی ملاکات میں ہم لوگ بھی ہو گئے۔“

”مسٹر قاسم بورنہ سمجھے! آئیے باہر چلیں۔“

وہ پھر لان پر نکل آئے۔ انہیں اپھیل چکا تھا۔ پروفیسر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے زمیں پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

”ڈیڈی... اٹھئے۔“ اُسکی نے اس کا شانہ ہلا کر کہا۔

”نہیں اٹھا جاتا۔“ پروفیسر اپنی شفاف کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔“ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ کم جنت پھر ایک ہاتھ مار گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔“

”ام کو بندوق دیو ساب! ام گولی مارے گا۔“ چوکیدار نے کہا جو قریب ہی کھڑا تھا۔

”تو کیا وہ ابھی اور ہر سے گذر رہا ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”گذرا نہیں تھا بلکہ اڑا تھا۔“ پروفیسر نے کرہا کر کہا۔ ”مز پر سے اڑتا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا نکل گیا۔“

”ام نہیں دیکھا ساب۔ اڑتا پڑا تھا؟“ چوکیدار نے خوفزدہ لمحہ میں پوچھا۔

”یہ رات کیے گزرے گی سائزہ۔“ پروفیسر پھر کہا۔

”آپ فکر نہ سمجھئے۔ میں بیٹیں بھر دیں گا۔“ حمید نے کہا۔

”قیاس کھہے ہے۔ قیابات ہے۔ قیسا پچھے۔ قس کا پچھے۔“ قاسم نے اکٹائے ہوئے لمحہ میں پوچھا۔

”میری بد نصیبی کا پچھہ مسٹر۔“ پروفیسر نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا پچھے کیے نکل آیا۔“

”اُسے... بد نصیبی میں بہت بڑے بڑے بچے نکل آتے ہیں۔“ قاسم ٹھنڈی آہ بھر کر

پڑھ کر بالے سیدھے تجربات کیا کرتے ہیں۔ بھلا سوچئے تو نہیں! مصنوعی اٹھے سے شتر رکھنے کے ساتھ ہی وہ بھی کھینچتا چلا آئے گا جس نے روشنداں پکے پیچھے رہی کا دوسرا سراپکڑ رکھا لیکن وہ شاہد اتنا ہی چالاک تھا کہ اُس نے ری چھوڑ دی اور حمید اپنے ہی زور میں دیوار پر جا ٹکرایا۔

”زندگی اجریں کر دی اس ایمیں کے بچنے۔“ پروفیسر ہانپا ہوا اٹھ رہا تھا۔
”لیاں بار بھی وہی تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”پھر کون ہو گا۔“ پروفیسر براہماشہ بنادر کرولا۔

”آپ نے دیکھا نہیں تھا۔“

”کیا فرق پوتا ہے دیکھنے نہ دیکھنے سے! اُس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“
”معاف سمجھ گا پروفیسر۔“ حمید نے خشک لمحے میں کہا۔ ”اگر شتر مرغ کے اٹھے سے کوئی ارسٹو بھی نکل پڑے تو ری کے استعمال سے اتنی جلدی واقف نہیں ہو سکتا اکتنے گھنٹے گذرے ہوں گے اُس کی پیدائش کو۔“

”وہ کوئی آسیب ہے؟ کوئی بُری روح ہے۔“
”بس تو پھر اب اس تجربہ گاہ کو کسی خانقاہ میں تبدیل کرو یعنی۔ تو ای کراچیے! اللہ رحم کرے گا۔“

”میرا مذاق مت اڑاؤ لے کے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

حمدی نے سارہ کی طرف دیکھا، جو خود بھی بہت براہماشہ بنائے کھڑی تھی۔
”یہ کیا بوریت پھیلائی ہے ڈیڑی! آپ نے ای میں کل صبح اسی پیشائی کا سیارا ہماں نیلام کر داویں گی۔“

”گولی مار دنا مجھے! میں تو پر لے ببرے کا گلدھا ہوں۔“ پروفیسر جھنچھلا گیا۔

”مجھے حیرت ہے کہ آپ کو اس کے متعلق ذرہ برابر بھی تشویش نہیں ہے۔“ حمید نے سارہ سے کہا۔

”میں صرف اس غم میں ذبلی ہو رہی ہوں کہ ہر سال ہزاروں نن اباچ جو ہے کھا جاتے ہیں۔ اگر ڈیڑی شتر مرغ پیدا کرنے کی بجائے چوہنے کی پیدائش روکنے کا کوئی مؤثر طریقہ ایجاد کرتے تو...!“

”پچھے نکالنا۔“

”مگر کچھ نہ کچھ تو نکلا ہی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”آپ تو دیکھ بھی ہیں اُس بچے کو۔“

”اس کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہیں آتا! بھی پچھلے ہی دنوں عربی زبان میں ایک قلم نسخہ پڑھ رہے تھے اُس میں کہیں دوچار اوت پانگ باشی نظر آگئی۔ میں شروع کر دیئے تجربے مثلاً اسی اور گوبر ملا کر مٹی کی ہاتھی میں رکھ دیا اور فرمائے گلے کہ دس دن بعد اس میں پچھوپا ہو جائیں گے۔ یا باغ میں جگہ جگہ کے سینگ دفن کر دیئے اور کہنے لگے کہ یہاں سر کنشے کے پودے اُگیں گے۔ اب صبح شام اپنے ہاتھوں سے پانی دے رہے ہیں۔“

”میری دلنشت میں تو کبھی نہیں ہوا۔“

”مگر یہ آدمی کا پچ۔“

”مجھے خوف ہے کہ ڈیڑی کسی مصیبت میں چھنسنے والے ہیں۔“

”اس خیال کی وجہ۔“

”وہ کچھ کہنے ہی ولی تھی کہ دوسرے کمرے سے پروفیسر کی صحیح سنائی دی۔ حمید ریو الفوز سنبھال کر جھپٹا۔“

پروفیسر فرش پر اونڈھا چلا تھا اور اُس کی ایک نانگ میں رسی کا پھنڈا تھا جس کا دوسرا سرا روشنداں سے کھینچا جا رہا تھا۔ لیکن کھینچنے والا شاہد اتنا طاقتور نہیں تھا کہ پروفیسر کو اُس کی جگہ جنیش بھی دے سکتا۔

سر کلر میرنگل

حمدی نے رسی کو پکڑ کر جھکا دیا اور خود عقبِ والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ سمجھا تھا کہ اُس کے

“آنے دو....!” اُس نے کہا۔
 پچھے دیر بعد فریدی برآمدے میں تھا اور سارہ اُسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی دوسری
 دیا کی مخلوق ہو۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ حمید سے واقعات معلوم کر رہا تھا۔
 “آپ پروفیسر کی صاحبزادی ہیں۔” حمید نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اوہ....!” فریدی اب اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن سارہ نے بوکھا کر اُس کے چہرے سے
 نظر بٹای۔ وہ پچھے نہ سی نظر آنے لگی تھی۔

”میں پروفیسر سے ملتا چاہتا ہوں مختار مد....!” فریدی نے کہا۔
 ”جی اچھا....!” اُس نے جلدی سے کہا اور صدر دروازے میں مڑ گئی۔ اس وقت اس کی چال
 پر گھوڑے کی ”سرپت“ کامگان ہو رہا تھا۔
 حمید کتاب ہو گیا۔ بھی لڑکی پچھے دیر پہلے اُسے کسی طرح گھستی رہی اور اب؟ فریدی کو
 دیکھ کر نہ تو اُس نے انجمن ترقی خواتین کے چندے کی رسید بک نکالی تھی اور نہ زبانی طراریاں ہی
 دکھائی تھیں۔

”یہ لڑکی بہت خطرناک معلوم ہوتی ہے۔“ حمید نے آہتہ سے کہا۔

”کیوں....؟“
 ”یہ پچھے شتر مرغ کے مصنوعی انٹے کی بجائے اس کی کھوپڑی سے نکلا ہے۔“
 ”مگر تم تو اسے دیکھ چکے ہو۔“

”ہاں دیکھ چکا ہوں۔ مطلب یہ کہ اس نے کہیں سے کوئی شریر پچھہ پکڑ کر پروفیسر کی مشین
 میں بند کر دیا ہو گا۔“

”مقصد....!“

”ایک بوبیچا اس روپے تو مجھ سے ہی وصول کر چکی ہے۔“

”کیا مطلب....!“

”جہاں کسی نے کیا وہ میں قدم رکھا اس نے انجمن ترقی خواتین کے چندے کی رسید بک
 نکالی۔ کل شاہد یہ برا شامد اور بزنس کرنے کیونکہ صحیح کے اخبارات میں یہ حیرت انگیز خبر ضرور
 آئے گی۔“

”گھنیا باتیں مت کیا کرو۔“ پروفیسر غریا۔
 ”کپٹن! ہائے آج تو ہی بڑے کھانے کا مودہ تھا۔ وہی میں اچھی طرح ڈوبے ہوئے اُن
 سرخ مر جیسی پودیہ اور پیاز کے قتلے... اور اوپر سے لیوں کارس۔“ سارہ نے کہا اور پروفیسر
 طرف دیکھنے لگی جو کسی ندیدے بچے کی طرح منہ چلا رہا تھا۔
 ”منہ میں پانی آ رہا ہے ذیڈی۔“ وہ نہ پڑی اور پھر سجیدگی سے بولی۔ ”لتنی گھنیا بات ہے اُن
 بڑا سامنے نہیں اور... ہلہلا... ہلہلا... ہلہلا...!“ وہ پھر ہنسنے لگی۔
 ”بہت بکواس کرنے لگی ہو۔“ پروفیسر نے جھینپے ہوئے ہوئے سے غصیلے انداز میں کہا۔
 کمرے سے باہر چلا گیا۔

حمدی چند لمحے سارہ کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بہت رحم دل آدمی ہیں۔ میں ہوتا تو کھال گراویٹر۔“
 ”پتے نہیں کس نے آپ کو تھانیدار بنا دیا ہے۔ آپ تو مویشی خانے کی محرومی کے قابل ہیں
 نہیں ہیں۔“

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں مختار مد کہ یہ آپ کی شرارت ہے۔“
 ”کیا مطلب....!“

”یہی پچھے....!“
 ”میں نے غلط نہیں کہا تھا کہ آپ سے مویشی خانے کی محرومی بھی نہیں سن بھل سکے گی۔“
 دفتارِ امارت کے کسی گوشے سے گھنٹی بجھنے کی آواز آئی۔

”کوئی آیا ہے شامد۔“ سارہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ حمید وہاں پھر کر کیا
 کرتا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے ہی برآمدے میں پہنچا تھا۔

”لبی جی... اب دوسرا پولیس ہے۔“ چوکیدار آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”کارڈیا ہے۔“
 سارہ نے کارڈ لے کر نام بلند آواز میں پڑھا۔ ”کر غل اے۔ کے فریدی۔“ اور استفہامی
 انداز میں حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں باس....!“ حمید بولا۔
 ”خدا کی پناہ... آپ ہی کیا کم تھے کہ اب بس بھی تشریف لائے ہیں... خیر۔“ وہ ٹھنڈی
 سانس لے کر چوکیدار کی طرف مڑی۔

”نہیں دوہروں کے بارے میں کہتا رہا تھا۔“
 ”آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“
 ”میں نہایت بذات آدمی ہوں! اس لئے میری ذاتی رائے محفوظ ہی رہنے دیجئے۔“
 ”دفعنا پھانک کی طرف یہ آواز آئی۔“ اب تن یہیں مر رہے ہو۔“
 ”اوہ...! سارہ چونک کر یوں۔“ یہ حضرت پھر واپس آگئے۔ غالباً جا طب آپ ہی ہیں
 کافی ہے تکلف ہے آپ دونوں کے درمیان۔“

”پھانک نہ کھلنے دیجئے گا۔“ حمید نے کہا۔
 ”واہ... اس بوریت میں اس سے بہتر تفریح اور کیا ہو سکتی ہے۔“ اس نے کہا اور پھر
 چوکیدار کو آواز دی۔ ”گل خان پھانک کھول دو۔“
 پھانک کے قرب وجاوں میں انہیں ہمراہ اس نے انہوں نے پھانک کھلنے کی آواز تو سنی لیکن
 قاسم اُس وقت تک نہیں دکھانی دیا جب تک برآمدے کے قریب روشنی میں نہیں آگیا۔
 ”آئیے... آئیے... خرپست صاحب۔“ حمید نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے اُس کا استقبال کیا۔
 لیکن قاسم نے برا سامنہ بنا کر ضرورت سے زیادہ بیزاری ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے
 وہ اُس کی صورت دیکھنے کا رداوارہ ہو۔

لیکن پھر یہ یہک چونکا اور آنکھیں نکال کر یوں۔ ”قیا... قیا! خرپست۔“
 ”نہیں تو... بھلا خرپست کے کیا معنی ہوئے۔“ حمید نے کہا۔
 ”نہیں مسر قاسم! یہ جھوٹے ہیں۔“ سارہ یوں۔ ”انہوں نے خرپست ہی کہا تھا۔“
 ”اے میں تمہارا کھون پی جاؤں گا سمجھئے۔“
 ”اور پیتے ہی مرجاوے گے! کیونکہ میر اخون بالکل سفید ہو چکا ہے۔“ حمید نے کہا۔
 ”لیکھ! اب خون بھی سفید ہو گیا۔“ سارہ نے مغموم لمحے میں کہا۔ ”یکسی کیسی گالیاں دے
 رہے ہیں۔“

قاسم کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں نکلی پوری ہی تھیں۔ حمید نے سوچا کہیں بالکل ہی
 کھوپڑی سے باہر نہ ہو جائے! ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ سبب پچھہ ہو جاتا ہے جیسے حمید ایک لڑکی
 کی موجودگی میں ہرگز پہنندہ کرتا۔

تم مولی کی آہٹ پر حمید خاموش ہو گیا۔
 پروفیسر خود ہی چلا آیا تھا۔ سارہ اُس کے پیچے تھی۔
 ”اوہ کرنگی آپ نے بھی تکلیف فرمائی۔ میں نے حد مختار ہوں۔“ پروفیسر بنے مصافر کے
 لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”بھچے افسوس ہے کہ میں نے نادقت تکلیف دی۔“
 ”اوہ کچھ نہیں آئے! اندر چلیں۔“

فریدی نے حمید کو دیں ٹھہر نے اور لڑکی کو بھی روکے رکھنے کا ایشارہ کیا۔ اُن دونوں کے
 مژبیتے ہی سارہ بھی دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ حمید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ٹھہر نیچے۔“
 وہ رک گئی اور اُسے اس طرح گھورنے لگی جیسے روکا جانا گران گزرا ہو۔
 ”کیا یہ حقیقت ہے کہ آپ کو اس پر ذرا سی بھی تشویش نہیں ہے۔“ حمید نے یونہی آغاز
 ٹھنگوں کے لئے کہا۔
 ”کیوں تشویش ہو۔“ وہ جھنجلا کر یوں۔ پھر مسکراتی اور بھنوں سکوڑ کر یوں۔ ”اگر کسی آدمی
 نے شتر مرغ کا لانڈ دیا ہو تو میں یقیناً پاگل ہو کر سر پیٹنے لگتی۔“

”مگر یہ شتر مرغ کا پھا آپ کی الجمن کے لئے بہت سود مند ثابت ہو گا۔“ حمید نے کہا۔
 ”وہ کیسے...!“ سارہ نے پکیں جھپکائیں۔ ”میں نہیں سمجھی۔“
 ”یہ خر کل صح کے اخبارات میں یقینی طور پر آئے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہاں شرفاء
 اور نجیب الظرفین لوگوں کا جم غیر نظر آئے گا۔ ہو سکتا ہے آپ اکیلے نام نہ کر سکیں اس لئے
 انہم کی کم از کم ایک یا ڈیڑھ درجن کارکنوں کو اسی وقت آگاہ کر دیجئے تاکہ وہ رسید بکیں لے کر
 صح ہی صح یہاں پہنچ جائیں۔“

”گل...!“ وہ چکلی بجا کر بہرہ مسرت لمحے میں یوں۔ ”اس مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ میں
 انہی جوانش سیکریڈ کوفون کرتی ہوں۔“

”لیکن ٹھہر نیچے۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر یوں۔ ”لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ آپ لوگوں نے یہ فراؤ
 محن اسی لئے کیا ہے۔“
 ”ہوں! سمجھی۔“ وہ آنکھیں نکال کر یوں۔ ”آپ یہی سمجھتے ہیں۔“

”تو میں آئنی کے یہاں کیوں جاؤں نہیں میں یہاں رہوں گی۔“
”اچھا تو اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”کیوں؟ کیا مصیبت ہے۔“ وہ پیر ٹھیک کر بولی۔

”سارہ! میری الجھنوں میں اضافہ نہ کرو۔ جاؤ۔“

دفعاً فریدی چوک کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا اور سارہ اتنی تیزی سے راہداری کی طرف مڑی تھی کہ حمید سمجھا شامدیوار سے ٹکرا جائے گی۔ وہ سید ھی اندر چل گئی۔
”اب آپ بھی تشریف لے جائیے۔“ فریدی نے قاسم سے کہا۔ ”رات زیادہ گذر پھل ہے۔“
قاسم برا سامنہ بنائے ہوئے برآمدے کے زینوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔ چند لمحے خاموشی سے گذرے۔

”میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر کہا۔
”فرمائیے... فرمائیے۔“

”اندر چلے۔“ فریدی نے کہا اور پروفیسر راہداری میں مڑ گیا۔
وہ ایک کمرے میں آئے۔ پروفیسر کی آنکھوں سے الجھن جھانک رہی تھی۔ اسما معلوم ہوا بہت جیسے اب وہ کسی قسم کی بھی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔
فریدی نے ایک کرسی پر نکلتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے صاحزادی سے فرمایا تھا کہ اپنے خیال کے مطابق آپ کسی سازش کا شکار ہو گئے ہیں؟“
”جی ہاں... میں نے کہا تھا۔“

”میں آپ کے اس خیال کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”کھلی ہوئی چیز ہے۔ آخر آدمی کا پچھے کیسے نکل آیا۔“

”تو شتر مرغ ہی کا پچھے نکل آتا۔“ فریدی نے اسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی پا گل سے گفتگو کر رہا ہو۔

”اخبارہ سو تراہی عیسوی میں برٹن کارلوس نے بھی یہی تجوہ کیا تھا لیکن بعض خامیوں کی بنا پر، کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“
”برٹن کارلوس کون تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔ ”میں نے یہ نام پہلی بار سنائے۔“

دفعاً اُس نے قاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی پہلا یہ کہتا تھا اس مغلہری سے۔“

پہلے تو قاسم کے چہرے پر بدحواسی کے آثار نظر آئے اور پھر یک بیک نہ پڑا۔ ”کوئی پہلا... ہی ہی... غلبہ ہی... ہاہا... ہاہا... وہ... حمید بھائی... وہا...!“

”کیا بات ہوئی۔“ سارہ نے تحریر انداز میں باری باری سے دونوں کی طرف دیکھا۔ ”پچھے نہیں۔“ قاسم بوکھلائے ہوئے لبجھ میں بولا۔ ”حید بھائی بڑے دلچسپ آدمی ہیں! مجھ پہلا کہتے ہیں... اور آپ غلبہ ہی ہیں... ہی ہی...!“

سارہ مایوسانہ انداز میں کچھ بڑبوائی جیسے کہہ رہی ہو۔ ”یہ تو پچھے بھی نہ ہوا۔“
لیکن حقیقتاً وسری طرف بہت کچھ ہو گیا تھا۔ قاسم اسے پند نہیں کرتا تھا کہ کسی لڑکی کے سامنے اس کی بیوی یا شادی شدہ زندگی کا حوالہ دیا جائے۔ اس وقت حمید بنے اس کو قابو میں رکھنے کے لئے پہلا اور مغلہری کی گویا حکمی دی تھی۔

”دفعاً تراہداری سے قدموں کی آوازیں آئیں اور فریدی برآمدے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پروفیسر بھی تھا لیکن حمید کو اس کا چہرہ اترنا ہوا سائز نظر آیا۔“
”تم نے رسی والے معاملے کے متعلق پوری طرح چھان میں نہیں کی تھی۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔
”من... نہیں۔“

”اوپر... قدموں کے جو شان طی ہیں وہ کسی بچے کے نہیں ہو سکتے... اور۔“ فریدی یک بیک قاسم کی طرف مڑا۔ ”آپ یہاں کیسے۔“

”جج... جی... مم... میں سر پرست ہوں۔“ قاسم نے بوکھلا کر جواب دیا۔
”کیا مطلب...!“

”آپ انہم ترقی خواتین کے سر پرست ہیں۔“ حمید بولا۔
”بے بی۔“ پروفیسر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم شہر جاؤ۔ پچھے دن آئنی کے ساتھ رہو۔“

”کیوں؟ کیا بات ہے ذمہ دی۔“ سارہ چوک کی پڑی۔

”میرا خیال ہے کہ میں کسی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔“

”آئکھیں تو آج تک دیکھی ہی نہیں۔ عینک اتنے ہرے شمشوں کی لگاتا ہے کہ آدمی پیشانی اور گاؤں کی بڑیاں ڈھک جاتی ہیں۔“

”اور غالباً چاپ میں بکلی سی لگڑاہٹ بھی پائی جاتی ہو گی۔“ فریدی نے پوچھا۔
”اوہ تو آپ اُسے جانتے ہیں۔“

”وہ کہاں رہتا ہے۔“
”اس سوال کا جواب مسئلہ ہے۔“ پروفیسر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیونکہ وہ اپنے بتائے ہوئے کبھی نہیں ملا۔ جب بھی ملاقات ہوئی اس سے کہا گیا کہ وہ فلاں جگہ نہیں ملا تھا فوراً ہی کہے گا اوہ میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا کہ میں فلاں ہوٹل میں رہتا ہوں۔“

”کسی نے اُسے آپ سے ملا تھا یا وہ خود ہی ملے آیا تھا۔؟“
”بس خود ہی آیا تھا۔“ پروفیسر نے لایپر والی سے کہا جیسے اس کے مقابلے میں خود کو زیادہ اہمیت دیتا ہو۔

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ڈاکٹر داؤد سے بھی آپ کی جان پچان تھی۔“
”ڈاکٹر داؤد کو۔“ پروفیسر نے تھیز انداز میں پلکیں جھپکا میں۔ ”میا آپ اُس ڈاکٹر داؤد کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو پچھلے دونوں قتل کر دیا گیا تھا۔“

”جی ہاں.... وہی....!“
”بس یونہی رسی سے تعلقات تھے۔“ پروفیسر نے کہا اور نیک یک ہنس پڑا بنتا ہی چلا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”یعنی طور پر پولیس چکر میں پڑ گئی ہو گی کہ آخر یہ اکتوبر میں اور دائرہ کیا بلہ ہیں۔“

”ظاہر ہے۔“ فریدی اُسے گھوڑتا ہوا بولا۔
”اُسے پچھلے کچھ دونوں سے خطبہ ہو گیا تھا کہ وہ سرکلر ٹریننگ بنائے کرے۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے ہو سکتا ہے مرتب وقت اُس نے اپنی حماقت تسلیم کرتے ہوئے اپنے الوبونے کا اعلان کیا ہوا اور اعتراف کیا ہوا کہ سرکل اور ٹریننگ بکھی میں عمل نہیں اختیار کر سکتے۔ اللہ ہی الگ رہیں گے یا پھر سرکل کے اندر ٹریننگ بکھی میں عمل نہیں اختیار کر سکتے۔ لیکن نہ وہ ٹریننگ سرکل کہلائے گا اور نہ سرکل ٹریننگ۔!“

”وہ برٹن کارلوس ہی تھا۔ اُسے ہم کسی ذو مرے نام سے نہیں یاد کر سکتے۔“
”ترانخ....!“ پروفیسر کی شفاف کھوپڑی پر ایک ہاتھ پڑا اور وہ کسی سمیت فریدی پر ڈھر ہوتا ہوا چیخنا۔ ”دیکھا دیکھا.... خدا غارت کرے۔“

نخما چھلاوہ حمید کی ناگوں کے درمیان سے نکل کر پھر پٹا اور پروفیسر کی کھوپڑی پر دوسرا ہاتھ جھاڑ دیا۔ فریدی پروفیسر کے نیچے تھا۔ حمید انہیں اسی حال میں چھوڑ کر چھلاوے کے پیچے دوڑا لیکن اس بارہ سید حاصل دروازے کی طرف گیا تھا۔ حمید نے اُسے پائیں باغ کے اندر ہرے میں گم ہوتے دیکھا۔

”کھدھر گیا۔“ فریدی نے پوچھا۔ حمید اس کی آواز سن کر مڑا لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر نہ جانے کیوں جھنچھلا گیا۔ پروفیسر بھی لگڑا اتنا ہوا اور ہر ہی آرہا تھا۔
حمدید نے پائیں باغ کے تاریک گوشے کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔
”مسئلہ ہے۔ وہ اس طرح ہاتھ نہیں آسکتا۔“ فریدی نے کہا۔ ”پروفیسر اچھا فریکیشن پیدا کیا ہے آپ نے؟“

”ڈاکٹر ڈوہرگن نے مجھے تباہ کر دیا۔“ پروفیسر ہانپتا ہوا بولا۔ ”اس تجربے کا مشورہ اُسی نے دیا تھا۔“
”یہ کون بزرگوار ہیں۔“

”میرا ایک جرم من ملا تھا۔ آج کل بیہی مقیم ہے۔“
”اُس کی کیا کو الفیکیشن ہے۔“

”خدا جانے۔ میں اُس کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ مجھے تو اُس کی صورت ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ بس زبردستی دوست بن بیٹھا تھا۔“

”بہت بد صورت آدمی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔
”اُس کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ فاختہ کے اٹھے سے برآمد ہوا ہو۔“ حمید بول پڑا۔
”واہ....!“ پروفیسر کے ہونٹوں پر خفیہ سی مسکراہٹ نظر آئی اور وہ بولا۔ ”اُس کے چہرے پر موچھوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں نظر آتا۔“

”اوہ....!“ فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”یہ سائنس ہے یا مسخرہ ہے! مجھے جرأت ہے کہ آج تک کسی نے آپ کی طرف دھیان کیوں نہیں دیا۔“

”کیا مطلب....؟“

”آپ تین دن کے اندر اندر اپنے ذرا لگنہ مدن کے متعلق تفصیلات میرے دفتر میں پہنچائیے!“

”بہت ہو چکا۔“ پروفیسر غر آکر کھڑا ہو گیا۔ ”بہت ہو چکا! براہ کرم تشریف لے جائے۔“

”ڈیٹی۔“ سارہ کی آواز پر وہ چونک پڑے۔ وہ بائیں جانب والے دروازے میں کھڑی

پروفیسر کو گھور رہی تھی۔ پھر اس نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے ذرائع آدمی کی

تفصیلات آپ کو انکم نیکس آفس سے مل جائے گی ایساں کے اتنی فرصت ہے کہ چارٹ بناتا پھرے!“

تفصیلات آپ کو انکم نیکس آفس سے مل جائے گی ایساں کے اتنی فرصت ہے کہ چارٹ بناتا پھرے!“

فریدی کی نظر پر پروفیسر کے چہرے پر تھی۔ اس نے ایک بار بھی لڑکی کی طرف نہیں دیکھا

تھا۔ اس کے اس روایے سے یہی ظاہر ہوا تھا جیسے وہ بات اسے مخاطب کر کے نہ کہی گئی ہو۔

یک بیک وہ پھر پروفیسر سے بولی۔ ”ڈیٹی.... تم نے پہلے کبھی کسی ڈاکٹر ڈوہر گک کا تذکرہ

نہیں کیا؟“

”کیا یہ ضروری ہے کہ تم سے ہر ایک کا تذکرہ کیا جائے۔“ پروفیسر جلا کر بولا۔

”ڈیٹی....!“ سارہ نے پھر آنکھیں نکالیں اور حمید آنکھیں مل مل کر اسے دیکھنے لگا۔

”اچھا تو تم ہی مغرب کھاؤں لوگوں سے.... میں جنم میں جارہا ہوں۔“ پروفیسر اٹھا اور کمرے

سے نکلا چلا گیا۔ حمید نے سارہ کے ہوتلوں پر مسکراہٹ دیکھی اور غیر ارادی طور پر اپنے ہوت

چائے لگا۔

”پور اولڈ تھنگ (Poor Old Thing)۔“ سارہ نے مختصری سائنس لی۔

”میں اتنی جنم میں گئے ہیں۔“ حمید نے تشویش کن لمحے میں پوچھا۔

”دیکھئے میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ڈیٹی کریک ہیں! بعض لوگوں کی ضد میں

سامنہ نہ بن بیٹھے ہیں اور ہزاروں روپے مفت میں براد کرنا ہے ہیں۔ لیکن سکتی تو ہے لیکن

یہ بچہ! ایا تو یہ کسی شرارت کا نتیجہ ہے یا ڈیٹی جنگ کسی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔“

”چچہ بھی ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”آپ اپنے ڈیٹی کی طرف سے غیر مطین ہی رہتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ اس نے فریدی کی آنکھوں سے بچت ہوئے کہا۔

قاسم کی شامت

فریدی نہ پڑا۔ لیکن پروفیسر اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس طرح ہن کر اسے

نے اس کی توہین کی ہو۔ ”ہم لوگ خواہ مخواہ اتنے دنوں سے سرما رہے ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”آپ نے پہلی بجائے یہ

مسئلہ بھی حل کر دیا۔“ ”اسکے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی! میرا دعویٰ ہے۔“ پروفیسر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”آس سے قاتل کے متعلق استفسار کیا گیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”تو پھر کسی الوہی نے اسے قتل کیا ہو گا۔“ پروفیسر نے لاپرواں سے شانوں کو جنش وی اور

پھر اس طرح فریدی کی طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی بہت ہی پرنداق جملہ کہہ کر داڑھا طالب ہو۔

”ڈاکٹر ڈوہر گک سے ڈاکٹر ڈاوڈ کے کیسے تعلقات تھے؟“

”میں کیا بتا سکوں گا اس سلسلے میں۔“

”بھی آپ نے انہیں ساتھ بھی دیکھا تھا۔...؟“

”نہیں؟“

”لیکن یہ بات آپ نے پھر بھی نہیں بتائی کہ آپ کو کسی سازش کا خیال کیوں پیدا ہوا۔“

”شتہ مرغ کے انڈے سے آدمی کا پچھہ کیوں نکلا! اور پھر اتنا بڑا پچھہ کہ دس انڈوں میں بھی نہ سکا کے۔“

”چلے! تسلیم کر لیا۔ لیکن اس تجربے کا انجام دیکھنے کیلئے شہری حکام کو کیوں مدد گیا گیا تھا۔“

”وہ میرے احباب تھے! انہیں ایسے تجربات سے دلچسپی ہے۔“

”کیا پہلے بھی آپ کا کوئی تجربہ بے کامیاب ہو چکا ہے۔“

”ہاں میں نے بچھوپیدا کے تھے! ایسے چوہے پیدا کئے تھے جو چنکبرے یعنی سفید اور سیاہ تھے۔“

”بچھو اکثر شریر بچے بھی پیدا کر لیا کرتے ہیں اور چت کبرے چوہے اور مختلف اقسام کے

چوہوں کی کراس بریٹنگ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔“

”آپ خواہ مخواہ سائنس میں اپنی ناگف کیوں اڑا رہے ہیں۔“ پروفیسر غصیلی آواز میں بولا۔

جیری اپنے بس کے متعلق الجھن میں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بھی نیا گرہ ہی میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرے لمحے میں اس سے کہاں ملاقات ہوگی! مثال کے طور پر اگر اسے فون کال کے ذریعہ کرہے نمبر ڈن میں طلب کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ کرہ نمبر دس ہی میں رہتا ہو گا ایک گھنٹہ بعد اسی کمرے میں اُسے کوئی دوسرا آدمی نہیں ہو سکتا کہ وہ کرہ نمبر دس ہی میں رہتا ہو گا ایک گھنٹہ بعد اسی کمرے میں اُسے کوئی دوسرا آدمی نظر آتا۔ پھر بھلا جیری میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ اُس دوسرے آدمی سے اسکے متعلق کچھ پوچھ سکتا۔ بس کے تصور ہی سے اُس کا دم نکلا تھا۔ پتہ نہیں خود اُسے ہی کب امتیازی تنفس نصیب ہو جائے! اپنے اس ساتھی کی موت اسے ابھی تک نہیں بھولی تھی جسے بس نے امتیازی تنفس عطا کیا تھا اور پھر اسے اپنے دوست یوں سمیت اس کی لاش ٹھکانے لگائی پڑی تھی۔ وہ کتنا خطرناک کام تھا لاش کو توڑ مر دُز کر صندوق میں بھرتا اور بھرے پرے ہوٹل سے نکال لے جانا۔ اس وقت بھی وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بھی۔ ظاہر تھا کہ بیہاں بس کے علاوہ اور کون اُسے فون کرتا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسیور اخیال۔

”کمزہ نمبر آٹھ میں ملو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”اوکے... بس....!“ اس نے رسیور رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ کرہ نمبر آٹھ کے دروازے پر ہوئے ہوئے دستک دے رہا تھا۔

”آ جاؤ...!“ اندر سے آواز آئی۔

حالانکہ کمرے میں دھوپ کا گذر بھی نہیں تھا لیکن بس کی آنکھوں پر تاریک شیشیوں کی عینک بدستور موجود تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس غیر معمولی عینک کو دیکھ کر اسے بڑی شدت سے گھٹن محسوس ہونے لگتی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ بس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ خلاف معمول اس کا لہجہ نرم تھا۔ جیری کاپ گیا کیونکہ اس کا زرم لہجہ عموماً موت ہی کی آواز ثابت ہوتا تھا۔

”رپورٹ....!“ بس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کل رات میں اس وقت تک وہاں رہا جب تک کہ کرنل فریدی اور کیپن حمید وہاں سے

جانبے کیوں وہ اس سے آنکھیں ملا کر گفتگو نہیں کر رہی تھی۔

”اگر آپ غیر مطمئن نہیں تو پھر چھپ کر ہماری گفتگو سننے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔“

”اگر نہ سنت تو آپ نہیں معلوم کتنا غلط اثر لے کر یہاں سے جاتے۔“

”یہر ہر حال آپ غیر مطمئن ہیں اور بیان نہیں آپ نے اُن پر کئی طرح کی پابندیاں بھی لگا کی ہیں۔“

”تپ پچھے اپنے بھلے آدمی کو غصہ دلا سکتے ہیں۔“ سارہ نے ناخن گوار لمحے میں کہا۔ ”بھلا ہمارے نجی معاملات میں آپ کیوں دخل اندازی کر رہے ہیں۔“

”لیکن اگر کل پہ میں پچھے شہری نظم و نقش میں داخل انداز ہوا تو پروفیسر بہاں ہوں گے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی اکیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ذیڈی ہی کا کیا خٹر کر رہا ہے۔“

”اچھا محترمہ...! فریدی امتحانا بولا۔“ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بہاں پھر آتا پڑے گا۔“

سارہ بہ آدمت تک اُنکے ساتھ آئی تھی۔ لیکن شاکر اس کا مذہب زیادہ خراب ہو گیا تھا کیونکہ جس زندہ دلی نے ساتھ اس نے حمید کا استقبال کیا تھا اتنی بے دلی سے ”الوداع“ کہی تھی!

چھانک کے قریب پہنچ کر حمید نے کہا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ بس اسی طرح سائنس آیا تھا جیسے اچانک بھلی کی چمک گئی ہو۔

”اس کے صوفے کے پیچھے تھا۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن پہلے میری نظر بھی نہیں پڑی تھی۔ یہ باپ بیٹی میرے لئے ایک نئی آنکھ بن گئے ہیں۔ اب پروفیسر غوری کے متعلق بھی چھان میں کرنی پڑے گی۔“

”اس نے ڈاکٹر ڈوہرگ کا جو حلیہ بتایا تھا۔ حمید والٹن کے جملے سے مختلف نہیں معلوم ہوتا اور تجربے کا مشورہ بھی اسی نے دیا تھا۔“

”بھی کچھ سوچا پڑے گا۔“

چوکیدار نے چھانک کوولا۔ لیکن اپنی گاڑی پر نظر پڑتے ہی حمید بوکھلا گیا۔ پچھلے دو نوں پہلوں کی ہوانہ درد تھی۔ فریدی کی لئکن صحیح و سلامتی میں! حمید محدثی سائنس لیے کر بولا۔ ”یہ قاسم ہی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ مجھے یہاں دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔“

چوکیدار کو بتا کر حمید کی کارروائیں جھجوڑوی گئی اور وہ لئکن میں بیٹھ گیا۔

لئے تھاں دہیں۔ تمہارے متعلق میں نے ابھی تک اسکی کوئی بات نہیں سوچی۔
میں کہنا چاہتا ہوں بس کہ فریدی ایک خوشگل سانپ ہے لیکن انتہائی زبردیا۔
”ہو سکتا ہے؟“ بس نے لاپرواٹی سے کہا۔ ”تو پھر....!“

”مے راستے سے ہٹادیا چاہئے۔“

”پتے نہیں تم لوگ اس سے کیوں خاکہ ہو۔“

”اس شہر میں کامیابی کی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ فریدی کو ہماری راہ میں حائل ہونے کا
وقت نہ ملتے۔“

”اوہ۔ ختم کرو۔ میں اُسے ایسا سقون دوں گا کہ پچھلے سارے کارناموں پر خاک پڑ جائے گی۔
اُنے ابھی تک گدھے ہی ملتے رہے ہیں۔“

”باس کی مرضی۔“

”پروفیسر غوری پر کڑی نظر کھو۔ وہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ میں اُسے پرے کے
کاؤڈی سمجھتا تھا۔“

”مجھے بھی وہ احتیف معلوم ہوتا ہے... البتہ اس کی لڑکی....!“

”اپنی موت کو آواز نہ دینا۔“ بس ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں اسے پسند نہیں کرتا کہ میرا کوئی
آدمی عورتوں کے چکر میں پڑ کر میرے لئے کسی قسم کا مسئلہ بن جائے۔“

”میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا بس کہ وہ بہت زیادہ چالاک معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے پروفیسر
سے پوچھا تھا کہ اُس نے اُسے کسی ڈاکٹر ڈوہرگل کے متعلق کیوں نہیں بتایا! پروفیسر شاہد اُس سے
ذرتا بھی ہے ایسے باپ بیٹی آج تک میری نظروں سے نہیں گذرے۔“

”اُس کی لڑکی کے متعلق بہت زیادہ نہ سوچو۔ اس سے بیماری ہر یکڑ سکتی ہے۔“

”نہیں بس مجھے لڑکیوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔“

”لیکن سوال تو یہ ہے کہ پروفیسنر نے اندرے کی آڑ میں یہ فراڈ کیا ہی کیوں؟“ بس کچھ سوچتا
ہوا بولا۔

”اگر آپ بھی اُسے فراڈی تصور کرتے ہیں تو مجھے بھی پروفیسر کے بارے میں اپنی رائے
تبديل کرنی پڑے گی۔“

چلے نہیں گئے تھے۔ پروفیسر غوری نے انہیں بتایا ہے کہ اس تجربے کا مشورہ ڈاکٹر ڈوہرگل نے
دیا تھا اور اُس نے انہیں آپ کا حلیہ بھی بتایا تھا۔

”یہ خاصی نامعقولیت ہوئی ہے۔“ بس بولا۔

”پچھے نے ایک بار فریدی کی موجودگی میں بھی پروفیسر کی مرمت کی تھی۔“

”اوہ یہ پچھے اپنے نہیں کم بنت کیا بلے ہے۔“

”وہ اُسی اندرے سے لکھا ہے بس....!“

”بکواس ہے۔ وہ تجربہ ہی بکواس تھا۔“

”اوہ.... تو پھر.... میں تو سمجھا تھا۔“ جیری کی آنکھیں حیرت سے بچل گئیں۔

”میں نہیں جانتا۔ وہ کیا بلے ہے۔“

”اور ہاں جناب! الومنیٹ اور دائرے کے متعلق ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔“

”وہ کیا....!“ بس چمک پڑا۔

”آپ کے تذکرے کے بعد ڈاکٹر داؤڈ کا تذکرہ نکل آیا تھا۔ فریدی نے پروفیسر سے پوچھا کہ
کیا اُس نے کبھی آپ کو اور داؤڈ کو ساتھ بھی دیکھا تھا۔ پروفیسر نے نفی میں جواب دیا۔ پھر ملنٹ
اور دائرے کی بات چھڑ گئی۔ پروفیسر نے بتایا کہ ڈاکٹر داؤڈ اُن دونوں کی سر کلر ٹرییگل کا وجود ثابت
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو قطعی ناممکن ہے لہذا پروفیسر کی دانست میں اُس نے مرتب وقت
اپنے اُنہوں نے کے اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی اعلان کیا تھا کہ ملنٹ اور دائرہ دو مختلف
النوع اشکال ہیں۔ وہ ایک دوسرے میں ضم ہو کر کبھی کوئی تیری شکل نہیں اختیار کر سکتیں۔“

”بکواس ہے۔“ بس نے رہا سامنہ بتایا پھر بولا۔ ”فریدی نے اس خیال پر رائے زندگی کی تھی یا
نہیں۔“

”اس نے بھی اس کا مفعکہ اڑایا تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی تھہ تک ضرور پہنچ گا۔“

”باس ایک بات کہوں۔“ جیری خوفزدہ آواز میں بولا۔ ”یوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری
موت بھی آپ ہی کے ہاتھوں آئے گی۔“

”یہ بھی بکواس ہے۔ میں اسی وقت زندگیوں سے کھلیتا ہوں جب مجھے یقین ہو جائے کہ وہ
رہا۔“

بہت سے آنکھیں چھاڑ کر اُسے دیکھا۔ شیر و انی میں وہ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی منارہ پر غلاف نہ لے دیا گیا ہو۔ حمید نے اُسے آج تک شیر و انی اور شلوار میں نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ پگڑی! قاسم کی پوچی کافی کے مارے برا جال تھا کیونکہ پگڑی نے اُسے بالکل ہی کارٹون بنایا کہ رکھ دیا تھا۔ لیکن خروزی ہی سی دیر میں وہ بہت زیادہ بور نظر آنے لگی۔ کیونکہ پھیپھیوں اور فقروں کی بھرمار بڑھتی باری تھی۔ کچھ بھی ہو وہ اُس کا شوہر ہی تھا۔

”آپ مجھے اسی لئے لائے تھے حمید بھائی۔“ اُس نے سور کر کہا۔ ”خدا نہیں عقل دے۔“ ”میں صرف یہ دکھانے کے لئے لایا تھا کہ یہ کتنا علممند ہے۔ اگر احتمن ہوتا تو گھر ہی سے پگڑی باندھ کر آتا۔“

”گھر سے تو اپچھے بھلے گئے تھے۔ میں نوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کے پاس اس قسم کا بھی کوئی بس ہو گا۔ آخر یہ پگڑی کیوں باندھ گئی ہے۔“

”قوم کی لیڈری ہی ٹھہری۔ اس میں بہر حال حقہ بننا پڑتا ہے۔“ کسی نہ کسی طرح شور کم ہوا۔ دو چار نظیں پڑھی گئیں۔ سیکریٹری (سائز) نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر وہ شنی ڈالی۔ صدر کا تعارف ہوا۔ سائز نے بتایا کہ کس طرح چندے کی معمولی اپل پر جناب صدر نے یکمشت تین ہزار کا عطیہ دیا تھا۔

”خدا کی پناہ۔“ قاسم کی بیوی بڑھ رہی۔ ”بہر اس طرح روپے اڑائے جاتے ہیں اور مجھ سے کہا جاتا ہے کہ کھپات شعارات بنو۔“

خدا خدا کر کے خطبہ صدارت کی باری آئی اور قاسم میں بیوی الجھ کر بولی۔ ”میں تو جار ہی ہوں جید بھائی۔“

”واہ.... اصل کہانی تواب شروع ہو گی۔“

قاسم کھڑا ہوا۔ مگر وہ بُری طرح ہاپ رہا تھا۔ کبھی ہنپتے کے سے انداز میں دانت نکل پڑتے اور کبھی ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے جاتے۔ مایک کا اشینہ اس انداز میں پکڑ رکھا تھا جیسے اُسے چباہی جائے گا۔

”پھر بخشنک تمام اس کے حلق سے آواز لکل۔“ ”خواتین و خواتین۔“ ”ہیر ہیر....!“ مجمع نے تالیاں پیشیں۔

”یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے کہ یہ بچہ کیا بلا ہے۔“



حمد کو بھی انجمن ترقی خواتین کی طرف سے جلسے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس بڑی کی نویست اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یعنی وہ تھا تو خواتین کا جلسہ لیکن اُس میں مرد بھی ملے گئے تھے۔ کارڈ پر تحریر تھا کہ جلسے کی صدارت مسٹر قاسم آف عاصم ملٹی ائنسٹریز فرمائیں گے ہو سکتا ہے کہ یہ جلسہ بھی فتنہ ہی بخوبی کے لئے منعقد کیا جا رہا ہو۔ حمید نے سوچا بہر حال اُسے تو شرکت کرنی ہی تھی کیونکہ جلسے کی صدارت قاسم کرنے والا تھا۔

اُسے پروفسر غوری کی تجربہ گاہ کی وہ رات نہیں بھوپی تھی۔ سب اُس کی گاڑی کے پچھلے پر ہوا سے محروم ہو گئے تھے۔ لہذا ہر صورت میں قاسم سے بدله لینا تھا۔ جلسہ گاہ میں پہنچنے سے دوسرے گھنٹے قبل وہ قاسم کی کوئی پر جادہ ہمکا۔ لیکن قاسم سے وہاں ملاقات نہ ہو گئی۔ باتوں ہی باتوں میں اس کی بیوی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بچاری کو کیا پتہ کہ اس کا شوہر عورتوں کی کسی انجمن کا سرپرست بھی ہو سکتا ہے اور اُس کے کسی جلسے کی صدارت کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ حمید کی زبان کسی ایسی بدعت کی اطلاع پا کر وہ سنائے میں آگئی۔ پھر ہنپتے گی اور خیال ظاہر کیا کہ حمید اُسے اونانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن پھر اُس صورت میں یقین کیوں نہ آتا جب حمید نے جیب سے دعوت نامہ ہی نکال کر اُس کے سامنے پخت دیا۔ وہ بہت بھی پھر کہنے لگی کہ وہ بھی کیوں نہ اُس جلسے میں شرکت کرے۔ دعوت نامہ کیپٹن حمید ائینڈ مسٹر حمید کے نام آیا تھا۔ اس لئے ایک عورت کی گنجائش بہر حال نکل سکتی تھی۔ ”مسٹر حمید“ پر اُس نے نہ اسمانہ بنایا۔ ”اوہ.... بہن یا بیٹی بن کر تو چل ہی سکو گی۔“ حمید نے کہا اور ”مسٹر“ کو ”مس“ بنادیا۔ اس طرح کیپٹن اور مس حمید جلسہ گاہ میں پہنچ۔ نشتوں کا نظام بڑے سلیقے سے کیا گیا تھا۔ اس لئے وہ اپنی مخصوص کر سیوں پر پہنچا دیئے گئے۔ جلسے کی کاروائی شروع ہو چکی تھی۔ مگر جناب صدر ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کے پہنچنے کے پانچ یا چھ منٹ بعد صدر کی آمد کا غلطہ ہوا۔ حاضرین انھوں نہ کر دیکھنے لگے۔ عجیب سا ہنگامہ برپا ہو گیا اور کسی لڑکی نے بلند آواز میں جملہ چست کیا۔ ”یہ صدر ہیں یا غیر....!“ لیکن قاسم اس وقت غدر سے بھی کوئی اونچی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ خود اُس کی بیوی نے بھی

چلا گئے گیا تھا۔
حید نے بھی بڑے پھر تینے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن قات کی دوسری طرف پہنچ کر اس نے میدان صاف پایا۔ بعض لوگوں سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ انہوں نے کسی لڑکے کو قات پہنچنے دیکھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کی راہ فرار کے متعلق کچھ نہ بتا سکا۔
جبلہ درہم پر ہم ہو چکا تھا۔

بلڈ ہاؤٹڈ

بالآخر پروفیسر غوری کی شامت آہی گئی کیونکہ وہ مشین پچ شہر والوں کے لئے مستقل دریور بن کر رہ گیا تھا۔ راہ پلے لوگوں کے ہاتھوں سے چیزیں چھیننا اور یہ جا... وہ جانوروں سے عاجم بس کسی لاگو بندر کا روں ادا کر رہا تھا۔ لیکن اسی دوران میں کچھ بڑی وارداتیں بھی ہو گئیں۔ مثلاً ایک فرم کا خراچی بھی ایک بڑی رقم پیٹک میں معین کرنے جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بیک کی کپاٹڈ میں کار سے اترتا۔ ماتقی کی جہازیوں سے اسی پچھے نے اس پر چلا گئے لگائی اور بتوٹوں کا تحملیا چھین کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ اسی طرح ایک بڑے صراف کو بھی کچھ بہت ہی قیمتی زیورات سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں پروفیسر غوری کی جان کیسے چھوٹتی۔ اسے کوتولی طلب کر لیا گیا۔ لیکن پروفیسر کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں تھا کہ اس نے یہ سمجھ کر تجربہ نہیں کیا تھا کہ اس کے متاثر آدمی کے بچے کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ فریدی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اس کی دانست میں بھی وہ ایک نیم خبیث آدمی تھا۔ سارہ بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔ لیکن اس کے چہرے سے ذرہ برابر بھی پریشانی نہیں ظاہر ہو رہی تھی۔ پروفیسر کا بیان تحریر کیا گیا جس کے اختتام پر پروفیسر نے اپنے دستخط کئے۔ پھر فریدی نے کئی سادہ کاغذات پر بھی اس کے دستخط لئے۔ سارہ نے اس پر احتجاج کیا۔

“آپ مطمئن رہیں۔” فریدی نے کہا۔ “یہ دستخط غلط طور پر استعمال نہیں کئے جائیں گے۔ میں آپ کو لکھ کر دے سکتا ہوں کہ میں نے پروفیسر کے پچھے دستخط سادہ کاغذات پر لئے ہیں۔”

غالباً قاسم اس وقت خود شناس بننے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے اور زیادہ یوکھلا ہیں/ہر ہو رہی تھیں۔ ”خواتین خواتان“ غالباً اُسے غلط معلوم ہوا تھا لہذا اُس نے دوسری بار ”حاضرین حاضرات“ کی ہائک لگائی۔ قہمتوہوں سے پنڈال اڑا جا رہا تھا۔ قاسم نے نہ ہو کر بولنا شروع کر دیا ”جی ہاں میں صدر بننے کے لایک نہیں تھا۔ آپ کی ہمہ بانی ہے کہ آپ نے مجھے صدر بنا دیا آلا قسم... میں بالکل.... بالکل.... الوکا پٹھا... ارے باب رے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ دبایا۔ پھر بہت زیادہ زور سے بولنے لگا۔ ”جی تین ہزار کیا آپ پر تو تین لاکھ ثانر میں۔“ قسم اتنا جی چاہتا ہے کہ کھواتین ترقی کریں جی ہاں۔ آپ لوگ کر کٹ بھی کھیلا جائیں۔ بڑی جان آنکھ ہے بدن میں! اور قیاقیوں! میں اب کھوب جی خول کر چندہ دوں گا۔“ ٹھینگ سے کوئی پکھ کہا کرے۔ ”بھیر ہیکر.... قاسم صاحب زندہ باد۔“

قاسم نے کسی پر جوش مرغ کی طرح گردن اوچی کی اور بولا۔ ”نہیں ابھی جندہ باد نہ کہنے ابھی مجھے خدمت کرنے دیجئے۔ میں آپ سب کے لئے پاگل ہو جانا چاہتا ہوں... مطلب یہ کہ ... مطلب یہ کہ ... جی ہاں! کھوب ترقی قچھ۔ اگر تو کی آپ کو ترقی نہ کرنے دے تو مجھے بتائیے۔ سالے کاسر چھاڑ دوں گا۔“

”دھوپی ہے۔“ مجھ سے کسی نے ہائک لگائی۔

اس ریمارک پر قاسم کا منہ ذرا سائل آیا اور پھر یہ یہک اُس کی آنکھیں چنگالیاں بر سانے لگیں۔ پھرہ چقدر ہو گیا اور وہ میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔ ”کون ہو یہاں! جرسا منے تو آتا۔“

ٹھیک اُسی وقت ڈاکس کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی کھوپڑی ابھری! پھر کوئی اچھل کر قاسم پر آیا اور اُس کے دونوں ہاتھ اس کی ”سر بند“ کھوپڑی پر پڑے۔ دوسرے ہی لمحے میں قاسم میں سمیت ڈاکس کے پیچے تھا۔

حید اچھل کر ڈاکس کی طرف جھپٹا کیوںکہ یہ تو وہی لڑکا تھا جس کی پیدائش پروفیسر غوری کے بیان کے مطابق مشینی طور پر ہوئی تھی۔

اس لڑکے کی کہانی پچھلے دونوں میں اس بڑی طرح مشہور ہوئی تھی کہ شہر کا پچھے بچہ اس سے واقف تھا۔ لیکن اس وقت کسی کی بھی سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ وہی ہو گا۔ لوگ عموماً یہی سمجھتے کہ وہ کوئی شریر پچھے ہی تھا جو قاسم کی کھوپڑی پر دوہتزہ رسید کر کے ڈاکس کے پیچے والی قات

”خوشی کی بات ہی ہے کہ پروفیسر غوری مشلت اور وارئے سے بھی بڑا معہ بن کر رہ گیا ہے۔“
”کام مطلب....!“

”یا محب.....“
 ”اس کے جو دستخط میں نے اس وقت حاصل کئے ہیں وہ ان دستخطوں سے نہیں ملتے جن کے
 بک سے رقومات بکلوائی جاتی ہیں۔“

”تو پھر...!“ حمید چونک کر بولا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“

”مداز تحریری مختلف ہے۔“

”مگر اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ آپ نے اس کی تفصیل طلب کی تھی۔“
 ”لاکھوں کا آدمی ہے۔ ملک میں شیخے کے سامنے آلات ڈھالنے کا واحد کارخانہ اس کی
 ملکیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں مزید چھان بین فضول ہے۔ البتہ یہ دستخطوں کا معاملہ۔“
 ”یہ بھی نہایت آسان ہے۔ اس سے ایک چیک پر اپنے سامنے دستخط لے جئے اور اسے کیش
 کر بھیجو۔“ اس کے بعد اس سے تین ٹکڑے طور پر رضاخت کرنی پڑے گی۔“

"وہ سچھر میں انسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا۔"

”خدا مشئون کاشھا اے، رئے شہ میں آگ ہی کیوں نہ لگادے۔“

”اُنہیں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“

”آہ کاذاں سے کہ غوری کوئی بیو قوف آدمی ہے۔“

”ماں! میرا اندازہ یہی ہے۔“

”تو پھر میسم و اللہ نبھی کی آڑ میں اس بیچے کی پیدائش کا ذمہ دار ہے۔“

”ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ تھوڑی دیر تک پچھے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میا میجر والٹن نے ڈاکٹر داؤڈ کی کوئی میں صرف اس لئے آگ لگوانی ہو گی کہ الوا کا مجسمہ تلف ہو جائے۔ کیا نصیری اس لئے قتل کر دیا گیا تھا کہ اُسے الو کے متعلق کچھ معلوم تھا؟“

”ہرگز نہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو وہ نہ تو تمہیں اس طرح پکڑا تاہم مجھ پر حملہ کرنا تاہم نہ بعد میں مجھ سے فون پر گفتگو کر کے میرے شہہت کو مزید تقویت دیتا۔ اُسے اس کی پرواہ ہرگز نہیں کے کہ اس کی شخصیت روشنی میں آگئی ہے۔ جب اُسے اس کی پرواہ نہیں ہے تو اُلوں کے مجسمے کو

اس نے اس قسم کی ایک تحریر سائزہ کو دے بھی دی۔
نہ جانے کیوں حمید کی خواہش تھی کہ سائزہ اور پروفیسر کسی الجھن میں نہ پڑنے پائیں۔ جب
سے اس نے سائزہ کو دیکھا تھا وہ ایک پل کے لئے بھی اُس کے ذہن بے محنت نہیں ہوئی تھی۔ ایک
طرف وہ ان دونوں کو فراہ بھی سمجھتا تھا اور دوسری طرف یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجرموں کے
کٹہرے میں کھڑے ہوں۔

کچھ بھی ہو۔ پروفیسر کاشم معززین شہر میں ہوتا تھا۔ اس لئے یہی طے کیا گیا کہ اُس کی شہری اقامت گاہ میں وتنی طور پر نظر بند کر دیا جائے اور تجربہ گاہ پولیس کی گکرانی میں دے دی جائے۔ سارہ تجربہ گاہ ہی میں مقیم رہنے پر مصر تھی۔ فریدی نے کچھ دیر اس مسئلہ پر غور کیا پھر اُس کی اجازت دلوادی۔ کوتولی سے فریدی سیدھا اپنے دفتر آیا۔ حمید بھی ساتھ تھا۔ لیکن وہ آفس میں جانے کی بجائے کیٹشن ہی میں رک گیا تھا اُسے معلوم تھا کہ فریدی کسی فوری ضرورت ہی کے تحت آفس آیا ہے۔ درست اسکیم تو یہ تھی کہ اب وہ ان تمام لوگوں سے ملے گا جو اُس تجربے کے وقت پروفیسر غوری کی تجربہ گاہ میں موجود تھے۔ فریدی نے آفس کے اندر بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ اُس کے آفس کے دروازے پر آج کل ہر وقت دو سنتری موجود رہتے تھے اور جب بھی وہ آفس میں موجود ہوتا سرخ بلب ضرور روشن نظر آتا۔ کیٹشن حمید کے علاوہ اور ہر ایک کا داخلہ منوع تھا۔ جگے کے الیں۔ پی صاحب تو اُس کے دوسرا ہے ہی دن ایک ماہ کی رخصت پر چلے گئے تھے جب چہلی بار فریدی کے آفس پر سرخ بلب دکھائی دیا تھا اور انہیں آفس کے اندر داخل ہونے سے روکا گیا تھا۔ آج کل حالت یہ تھی کہ فریدی کے ہمدرد بھی اُس سے کترائے پھرتے تھے اور حمید سوچتا تھا کہ کہیں فریدی کو خفتہ نہ اٹھانی پڑے کیونکہ وہا بھی تک میجر واللن کا سراغ نہیں پاسکا تھا اور نہ ڈاکٹر داؤڈ ہی کے کیس میں کچھ ہو سکا تھا۔ پروفیسر غوری والے کیس میں بھی کسی حد تک میجر واللن کی پرچھائی نظر آئی تھی۔

کار میں بیٹھتے وقت حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”چکھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کام کرنا چاہئے۔“

“عيش....؟”， فریدی کا جواب تھا۔

”بہت خوش نظر آرے ہیں۔“

نوجوان حاکم بھی تھے جنہیں صرف سارہ سے دلچسپی تھی۔ چونکہ فریدی سے بھی ان کے تعلقات تھے اس لئے انہوں نے بڑی بے تکلفی سے اس کا اظہار کر دیا تھا۔“

کچھ بھی ہو لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا کہ پروفیسر نے کسی بڑی بیت سے یہ ڈھونگ رچایا ہو گا ان کا خیال تھا کہ کسی دوسرے نے پروفیسر کی حماقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ اُسے اس کی شہری قیامگاہ میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔

”میں نتیجہ لکا ہے اس بھاگ دوڑکا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ پروفیسر کے تجربے ہی کا سا کوئی نتیجہ نکل آئے۔“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔ ”اگر جلدی ہی ہے تو تم مرغی کے انڈوں پر بیٹھنا شروع کر دو۔“

”شاہد اسی کی نوبت آنے والی ہے۔ کیونکہ ایک اُو ہمیں اس طرح نچار ہا ہے۔“

”اُسے تو جب کہو بکڑ کر کسی درخت سے الٹا لٹکاؤ۔ میں نے ابھی تک اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔“

”ہمیں تو پھر ہم کیوں جھکھلارتے پھر رہے ہیں۔“

”صرف اس لئے کہ ڈاکٹر داؤد کے قتل کی وجہ معلوم ہو سکے! ہو سکتا ہے میثاث اور دائرے میں قتل کی وجہ ہی پوشیدہ ہو۔“

”سبحان اللہ! تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ خود قاتل ہی قتل کی وجہ سے نادا قف تھا۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو۔ مثال کے طور پر وہ ڈاکٹر داؤد سے کچھ معلوم رہے لی تو کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے نہیں بتایا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کو اس کا بھی احساس ہوا کہ اگر وہ نہیں بتائے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ کوئی ایسی ہی اہم بات تھی کہ ڈاکٹر اُسے نہ بتا سکا اور اپنی حفاظت کے لئے اُسے پولیس کی مدد حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو۔ مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی قاتل حملہ کر بیٹھا۔“

” دائیرے اور میثاث کی بات کیجھ۔“

” دائیرے اور میثاث ہی میں وہ سب کچھ پوشیدہ ہو سکتا ہے جو واللہ ڈاکٹر داؤد سے معلوم کرنا پاہتا تھا اور نیہ بھی واضح رہے کہ اُس نے ڈاکٹر سے یہ معلوم کرنا چاہا ہو گا کہ منار کا مرغی سال میں کتنے انشے دیتی ہے۔ واللہ کا قدم جس سرز میں پر پڑے اُس کے متعلق بھی سمجھنا چاہئے کہ

تلف کرنے کے لئے عدالت میں آگ لگوانا بھی مہمل ہو جاتا ہے اور یہ کہنا بھی فضول ہے کہ نصیری چونکہ اُلوں کی شخصیت سے واقع تھا اس لئے قتل کر دیا گیا۔“

”اُرے کچھ کہنا عقلمندی بھی ہے یا سب سہمی اور فضول ہی ہے۔“

”سارہ کو میٹھی نظر دو سے دیکھا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”عشق کرو اور موئٹی ہو جاؤ۔ اپنی لائکن میں تو قبول غ سوزی اور خون گجر پینے کے علاوہ اور کچھ نہیں رکھا۔“

”مذاق میں نہ نالئے۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔“

” غالباً اخلاقی قلب کی بھی خلکائیت ہو گی۔ اٹھا بیٹھا بھی نہ جاتا ہو گا۔ شروع میں مٹلی کی خلکائیت بھی رہی ہو گی۔ اٹھی کا شربت چالو۔ ڈفر کہیں کے۔ فرماتے ہیں الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنی کھوپڑی کیوں نہیں استعمال کرتے۔“

”اگر میں آپ کو کسی قابل نہ سمجھوں تو یقیناً مجھے بھی اپنی کھوپڑی استعمال کرنی پڑے۔ لیکن جب مجھے آپ پر اعتماد ہے تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں تو بعض اوقات آپ پر اتنے زور سے فخر کرتا ہوں کہ میری آنکھیں نکل پڑتی ہیں۔“

”کاش زبان کیسا تھا ہی کھوپڑی بھی کسی کام کی ہوتی۔“ فریدی نے ناخن ٹکوڑا لبھ میں کہا۔

”اُبھی کل ہی ایک لڑکی میرے گھوٹھریا لے بالوں کی تعریف کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ کیا محراب دار پیشانی ہے، دیکھ کر ہمایوں کا مقبرہ ہیاں آ جاتا ہے۔“

فریدی اُبھر اسامنہ بنائے ہوئے وٹا سکرین پر نظر جماے رہا۔

ترقبیاً تین گھنٹے تک وہ شہر کے اُن حاکم سے ملتے پھرے جن کی موجودگی میں پروفیسر نے اپنے تجربے کا حیرت انگیز نتیجہ دیکھا تھا۔ لیکن کسی نے بھی کوئی ایسی بات نہ بتائی ہے فریدی اپنی معلومات میں اضافہ سمجھ سکتا۔ سبھی اس پر متفق تھے کہ پروفیسر یوں قوف مگریاں باش، آدمی ہے۔

شہر میں صرف آٹھ سال سے مقیم ہے۔ اس سے پہلے ملک کے مشرقی حصے میں رہتا تھا۔ سائنسی آلات کا کارخانہ اُس کے باپ نے قائم کیا تھا، جو خود بھی ایک اچھا سائنسدان تھا۔ پروفیسر غوری تو محض مسخرہ ہے۔ خواہ مخواہ خود کو سائنسٹ پوز کرتا ہے اور وہ لوگ تو تفریحی اُس کی تجربہ کا گاہ میں گئے تھے۔ پروفیسر کو اُلوں بنانے کا نظرو ہوتا ہی وہاں ان کی موجودگی کا مقصد تھا۔ ان میں دو ایسے

وہاں کوئی میں الاقوای سازش جنم لے رہی ہے۔

"اچھا نصیری کا قتل...!"

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی راز میں ڈاکٹر داؤد کا شریک رہا ہو۔ لیکن قاتل نہیں چاہتا تھا کہ وہ راز پولیس بیک پہنچ کے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر داؤد کو بھی اُس نے اسی لئے مار ڈالا ہو کہ کہیں اُس نے وہ راز ظاہر کر دینے ہی کے لئے پولیس کو نہ طلب کیا ہو۔"

"اب سمجھ میں آ رہی ہے بات۔" حمید سر بلکر بولا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ نصیری کے بنائے ہوئے مجموں میں بہت زیادہ لوگ پیلی لیتے ہے۔"

"جی ہاں! مجھے یاد ہے۔"

"وہاں کی ایک ذمہ دار عورت قابو میں آگئی ہے۔ اس کے ذریعہ مجھے ایک تحریر ملی ہے، جو قاتل سے دو دن قبل نصیری نے اس غیر ملک سفر کے فتحی اناشیتک پہنچائی تھی۔" فریدی نے کہا اور داہنے ہاتھ سے اسی پیلی سنبھال کر باسیں ہاتھ سے نوٹ کردا۔ انہوں نے جب سے ایک لفافہ نکالا ہوا بولا۔ "اُس میں سے زورگ کا گند نکالو۔"

حمدی نے تہہ کیا ہوا گند لفافہ سے نکالا۔ لیکن تحریر پر نظر پڑتے ہی ایسا برآمنہ بتایا ہے

حق میں کسی نے زور سے کوئی نکلے ہوئے ہوں دی ہو۔

اُس پر عرفہ تین لفاظ لکھے ہوئے تھے۔ "چوبا محفوظ ہے۔"

"بہت مشہور بات ہے کہ الورڈ چاہے کھاتا ہے۔" حمید نے خنک لبھ میں کہلہ پڑتے نہیں کیسی خوست سوار ہے کہ اب الوداں اور چوہوں کے کیسے ہمارے مقدار میں لکھے جانے لگے ہیں۔"

"تحریر سو فیصدی نصیری ہی کی ہے۔ میں اطمینان کر چکا ہوں۔" فریدی بولا۔

"مگر یہ کیا بلد۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی طویل سلسلے کی کوئی اہم کڑی ہو۔" فریدی بنے کہا۔ "ویسے تمہیں وہ گاڑی تو یاد ہی ہو گی جس نے ایک کار کے پرچے اڑا دیے تھے۔ تین آدمیوں میں سے صرف ایک ہی اس قابل رہ گیا تھا کہ اس کی شناخت ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ وہ آدمی کون تھا۔ حالانکہ کار کا سراغ مل گیا ہے۔ اُس کی نمبر پلیٹ ضائع نہیں ہوئی تھی۔ نمبر

بھی صاف پڑھے جاسکتے تھے۔"
"کارکس کی تھی۔"

"اُسی سفارت خانے کی جس کا تذکرہ میں ابھی کرچکا ہوں۔ حادثے کی دوسری صحیح سفارت خانے کے ایک آفسر نے کار کی گشادگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ لیکن سفارتخانے کا کوئی بھی آدمی اُس لاش کی شناخت نہیں کر سکا تھا۔ ظاہر ہے کہ چوروں کو وہ کیا پہچانتے۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ وہ کارچر ایسی گئی ہو گی۔"

"میرا خیال۔" فریدی نے طویل سانس لی۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ سفارتخانے کے کچھ نامعلوم اجنبی ڈاکٹر داؤد کے قتل کے بعد سے پولیس کے گرد منڈلاتے رہے تھے۔ نصیری کے قتل کے بعد انہوں نے کسی ایسے آدمی کا تعاقب کیا جو میری کار کا تعاقب کر رہا تھا۔ ان لوگوں کی گفتگو تم نے سنی ہی تھی۔ لیکن وہ کون تھا۔ یہ ہمیں نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ جس کا تعاقب انہوں نے کیا تھا وہ نہ صرف اس تعاقب سے واقع تھا۔ بلکہ یہ بھی جانتا تھا کہ تعاقب کرنے والے کون ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ تمیوں ایسے انجام سے کیوں ووچار ہوتے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخبرِ واللہ کی مخالف پارٹی کا تعلق اُسی سفارتخانے سے ہے۔"
"فی الحال میں یہی سوچنے پر مجبور ہوں۔"

"اور یہ سب مثلث اور دائرے کے چکر میں ہیں۔"

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر باسیں آنکھ دبائی اور آہستہ سے بولا۔ "ہو سکتا ہے ہم سب ہی الوہی بن کر رہے گئے ہوں۔"
"کیوں....!"

"ڈاکٹر داؤد ایک میتھہ میٹھیشن تھا۔ اُس کی ساری عمر قسوں، دائروں اور مٹشوں کے چکر ہی میں گذری ہو گی۔ ہو سکتا ہے مررتے وقت جو ہم اُس نے اپنے ہی انہوں نے کا اعلان کیا ہو اور خالص فلسفیانہ انداز میں بتایا ہو کہ اس کی موت کا باعث دائرے اور مثلث ہی بنے ہیں۔ اگر ان میں سر کھپانے کی بجائے اُس نے تارzen بننے کی کوشش کی ہوئی تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اُس صورت میں قاتل کاریوں اور نکلنے سے پہلے ہی اُس کا گھونسہ اسکے جبڑے پر پڑا ہوتا۔"
"بس اب تم اسی پر ایک فلمی کہانی لکھ ڈالو۔ بڑا شے لے گی۔" فریدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”خوڑی دیر تک خاموش رہا پھر جھنچھلائے ہوئے انداز میں بولا۔“ اس کچھ راستے پر کیوں لٹکن کو چاہ کر رہے ہیں۔“

” بعض چیزیں لٹکن سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔“

کچھ دور چلنے کے بعد فریدی نے گاڑی روک دی اور نیچے اتر گیا۔ لیکن حمید کی دانست میں یہ گاہ اسی نہیں تھی جہاں تفریح گاڑی روکی جا سکتی۔ کچھ راستے کی دونوں جانب اوپنجی اور نینجی جھاڑیاں نہیں اور زمین بھی ہموار نہیں تھی۔ حمید نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کچھ نہیں پوچھے گا۔

دفعاً فریدی نے اسی انداز میں سیٹی بجائی جیسے کتوں کو متوجہ کرنے کے لئے بجا لیا کرتا تھا اور حمید بوكھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تو بوكھلا ہٹ اور زیادہ بڑھ گئی ہو گی۔

جب ایک بڑا سالمہ ہاؤٹ بائیں جانب سے جھاڑیاں پھلانگتا ہوا کچھ راستے پر آکردا ہو گا۔ فریدی نے اس کے پیچے پر ہاتھ ڈال دیا۔ حمید آنکھیں چھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتنا فریدی سے غیر مانوس رہا ہو لیکن یہ ان کتوں میں سے بھی نہیں تھا جن کی جھوول کی جھوول گھر پر موجود تھی۔

فریدی نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر کتے کو اندر چھوڑ دیا اور پھر دروازہ بند کر کے الگی نشست پر آبیجا۔ انہن اسٹارٹ کیا اور لٹکن پھر چل پڑی۔

”آپ کی تعریف....!“ حمید نے پچھے ٹرک کر کیتھے ہوئے کہا۔ کتابوں کی سرخ زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔

”اس پسٹر....!“

”اس نام کا کوئی کتاب ہمارے پاس کبھی نہیں تھا۔“ حمید نے کہا۔

”ایسے نہ جانے اور کتنے ہیں۔ جن سے پہلے کبھی تمہاری ملاقات نہیں ہوئی۔“ فریدی مسکرا لیا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ حمید نے جھلا کر پوچھا۔

”شامِ دس وقت کوئی ڈھنک کا شکار ہو ہی جائے۔“

”خوڑی دیر بعد وہ پھر کھلے میدان میں آگئے اور اب لٹکن کا رخ ڈیبور کی پہاڑیوں کی طرف تھا۔ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ڈیبور کی پہاڑیاں جھریاں جیسے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھیں۔ گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی یہ پہاڑیاں درندوں کے شکار کے لئے خاصی مشہور تھیں۔ لیکن حمید حمید کا منہ بگڑ گیا۔ ظاہر تھا کہ وہ راہ پر ویسر غور میں کی تجویز گاہ کی طرف ہرگز نہ لے جاتی۔

”اوہ... ہاں۔ اُس لڑکی کا کیا ہوا جسے ہم نے پوچھا۔“ پہنچاں میں داخل کیا تھا۔“

”ملٹری ہیڈ کو اڑ میں اس سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے لیکن وہ میجر والٹن کی قیام گاہ سے واپس نہیں ہے۔“

”بھجھ میں نہیں آتا کہ وہ ہماری معلومات سے کیسے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ ہماری معلومات سے اگاہ کیسے ہو سکے گا۔“

”یہ مسلسل بھی غور طلب ہے۔ میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ میری معلومات سے اگاہ ہونے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کرے گا۔“

”وہ پھر خاموش ہو گئے۔ کار جھریاں کی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ حمید غالباً فریدی سے میں پوچھنے والا تھا کہ اب کہاں چلتا ہے لیکن جھریاں کی سڑک پر مڑتے ہی اس کی ضرورت باقی نہ رہی اور وہ بے حد خوش نظر آنے لگا تھا۔ بہت عرصے کے بعد کسی لڑکی نے اسے اتنا متأثر کیا تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت اسی کے متعلق سوچنے میں صرف کر سکتا۔“

”کیا آپ اس سے سخنطوں کے اختلاف کے متعلق پوچھ سکتے ہیں؟“ حمید بولا۔

”نہیں... اسے خود ہی دیکھنا پڑے گا۔ تم بھی اس کا ذکر کرو مत کرنا۔“

”بھجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسے حالات میں یہاں تھا رہ کر کیا کرے گی۔“ حمید نے کہا اور کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”ایسی صورت میں یہی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ بچہ اسی کی شرارت کا نتیجہ ہے۔“

”لیکن حمید صاحب! ایسا پھر بتا پچھے آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اگر تم کبھی اُسے

ہاتھ بھی لگا سکو تو مجھے دس ہزار روپے نقدوں عوول کر لیتا۔“

”ہا میں! تو کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ شتر مرغ کے اٹھے سے برآمد ہوا ہے۔“

”فی الحال شتر مرغ کے اٹھے یہی سے برآمد ہوا ہے۔“

”جہنم میں جائے۔“ حمید جھلانے ہوئے لجھے میں بولا۔ ”میں خواہ جھک مار رہا ہوں۔“

دفعاً فریدی نے گاڑی ایک کچھ راستے پر اتار دی اور حمید چوک کر بولا۔ ”اوہ، کہاں؟“

”بس چلتے رہو۔“ فریدی نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

حمد کامنہ بگڑ گیا۔ ظاہر تھا کہ وہ راہ پر ویسر غور میں کی تجویز گاہ کی طرف ہرگز نہ لے جاتی۔

چکیلا غبار

209

جلد نمبر 27

حاصل کیا گیا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو وہ فریدی سے اس قدر مانوس نہ دکھائی دیتا تو پھر وہ یقیناً فریدی ہی کا کتابخا اور اگر فریدی ہی کا کتابخا تواب تک حمید اُس کے وجود سے کیوں ناداقف رہا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں کہاں سے آیا۔ ”اگر میں الجھن کے عالم میں مارا گیا تو آپ کو میری قبر دوبارہ کھدوں اپنے پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔“

”یہ کتا! اگر یہ آپ ہی کا ہے تو ان جھاڑیوں میں کہاں سے آیا۔“ میں نے ایک آدمی کو وقت دیا تھا کہ وہ کتنے سمیت وہاں موجود رہے۔ ”فریدی مسکرا لیا۔“ ”بھی تم اس پکڑ میں نہ پڑا کرو۔ بہتری ایسی باتیں ہیں جو میں تمھیں بھی نہیں بتا سکتا۔“ ”یہ پھٹی ہوئی جراب کس کی لے بھاگے تھے۔“ حمید نے جل کر کہا۔ ”چلو وقت نہ برباد کرو۔ کتنا پاگل ہوا جا رہا ہے۔“

”مگر میری یہ حالت ہے کہ اگر میں اس وقت اسے کاٹ لوں تو یہ انھ کرپانی بھی نہ پی سکے گا۔“ ”چلو...!“ فریدی بنے اسے باسیں ہاتھ سے دھکیلا۔ اُس نے کتنے کا پٹھ چھوڑ دیا تھا۔ کتا اتنی تیز رفتاری سے نہیں چل رہا تھا کہ انہیں اس کے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ اُن سے اُس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ دس فٹ رہا ہو گا۔ وہ پھر اسی جگہ رک گیا جہاں پبلے رکا تھا۔ راستے کے دونوں جانب کہیں پھر میلے تھے اور کہیں گھری گھری درازیں تھیں جن پر مختلف قسم کی گھنی جھاڑیاں سایہ کئے تھیں۔ اچانک کتا ایک دراز میں اترنا چلا گیا۔

”یہ کیا...!“ فریدی چونک کر بولا۔ وہ اسی دراز میں جھاٹک رہا تھا۔ حمید بھی جھک پڑا۔ یہ نیلے رنگ کی کار کی چھٹت تھی جسے غالباً اسی درپڑی ہی کے ذریعہ نیچے اتارا گیا تھا۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کی نظر اُس پر نہیں پڑ سکتی تھی تا تو قیکے وہ خاص طور سے اُسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ دراز کے اوپر جھکی ہوئی جھاڑیاں بہت گھنیری تھیں۔

فریدی دراز میں اترنا چلا گیا۔ حمید کو اس تک پہنچنے میں خاص دشواری پڑیں آئی۔ کار کو قریب سے دیکھ کر وہ تحریر رہ گیا۔ فریدی بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتا اُس کے ہاتھ سے نکل ہی گیا، ہوتا۔ اگر اُس نے اس کا پٹھ مضبوطی سے نہ پکڑ رکھا ہوتا کیونکہ وہ ایک طرف طرف نکل جانے کے لئے زور کر رہا تھا اور ساتھ ہی اُس کے ملنے سے عجیب قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

208

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فریدی خواہ مخواہ درندوں کے شکار کے لئے چل پڑا ہو گا۔ ذیہور کے علاقے میں پہنچ کر فریدی نے ایک جگہ کارروں کی اور حمید سے اتنے کو کہا۔ کہ تو بھی اتارا۔ اور پھر یہ بیک بیک حمید نے محسوس کیا کہ وہ کسی آدمی ہی کا شکار ہو سکتا ہے کیونکہ فریدی نے ایک پھٹی ہوئی جراب سیٹ کے نیچے سے نکال کر کتے کے سامنے ڈال دی اور وہ اسے سونگھا بھا تھا۔ یہ لوگ ایسے ہی راستے پر رکے تھے جہاں سے جنگل میں داخلہ ممکن تھا۔ عام طور پر شکاری اسی راستے سے گذر رکتے تھے۔

کہتے نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور بلکل سی غواہت کے ساتھ ساتھ ایک طرف دوڑ نے لگا۔

ہنگامہ اور حیرت

راستہ اس قابل تھا کہ کار جاسکے۔ لیکن فریدی کے انداز سے نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کار استعمال کرے گا۔ وہ وہیں کھڑا کتے پر نظریں جمائے رہا۔ کتا پچھے دور جا کر رک گیا تھا۔ تھوڑی دیر قرب و جوار کی زمین سو گھنٹا رہا پھر اُن کی طرف پلٹ آیا۔

اب وہ فریدی کے پیروں سے اپنا جسم رگڑتا ہوا ملنے سے بلکل بھلی آوازیں نکال رہا تھا۔ فریدی نے ٹرک آہستہ سے کہا۔ ”ریوالز نہ ناتھماہے پاس۔“

”ہے لیکن صرف چھ راؤ نہیں۔“ حمید نے جواب دیا۔

”اگلی سیٹ کے نیچے سے دو پیشیاں نکال لو۔“

”کیوں! کوئی لمبا معاملہ۔“

”احتیاط! تو قع نہیں ہے کہ بات زیادہ بڑھ سکے۔ ویسے وہ آدمی جس کی تلاش ہے وہ اسی راستے سے گذر تارہ ہے۔“

حمدی نے کار تو سوں کی دو پیشیاں نکالیں۔ اُسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ لیکن کی سیٹوں کے نیچے اچھا خاصاً سلسلہ خانہ موجود تھا۔ وہ فریدی ہی کیا جس کے مختلف روزانہ نئے نئے اکشافات نہ ہوں۔ اب یہ کتا ہی حمید کے لئے نئی چیز تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ عاریتاً کسی سے

امپری کو اسی طرف جانے دیا جائے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جواب والے کی راہ پر لگ پکا ہے۔
”مگر یہ مارڈا لگایا تو۔“

”یہ اب خود ہی اپنی خفاظت کر سکے گا۔ ایسے حالات میں آدمی کا کام نہیں ہے کہ اپنے کتنے کو بھی بچا سکے۔ پرواہ نہ کرو۔ اسے جانے دو۔“
پھر اس نے کتنے کو مخاطب کیا۔ ”کوئیک اسپری... کوئیک۔“ اور کتنا تیر کی طرح سامنے والے نشیب میں اترنا چلا گیا۔

فریدی اور حمید راستہ کاٹ کر مخالف ستوں میں ریگنے لگے۔ حمید کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرتا پڑ رہا تھا۔ جا بجا کافیوں دار جھاڑیاں تھیں۔ چنانوں پر بزرگ کی کافی کی پھسلن پر نہیں جانے دیتی تھی۔ کچھ دور پر چل کر وہ رکا۔ باہمیں جانب وہ چنان نظر آرہی تھی جس پر پہنچ کر وہ اپنے اندازے کے مطابق فائزگ کرنے والوں سے دوچار ہو سکتا۔ لیکن اس چنان پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ یہ بھی کافی سے ذکری ہوئی تھی۔ وہ پھر آگے بڑھ گیا۔ ممکن تھا کہ کوئی معقول سا راستہ نظر آجاتا۔ چنان کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی احتیاط تو بر تی ہی تھی! وہ چاہتا تھا کہ فائزگ کرنے والوں کی خفاظت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اچاک کسی نے اس پر چھلانگ لگائی اور وہ خود اپنی ہی غفلت کا شکار ہو گیا اور حمید اندازہ نہ کر سکا کہ وہ چنان کے اوپر سے کوڈ اتھایا چکے ہی کہیں چھپا بیٹھا تھا۔

حملہ شدید تھا لیکن حمید نے اپنے اوسان بحال رکھے۔ اسی جدو جہد کے دوران یہ بھی سوچا کہ گولیاں تو چل ہی رہی ہیں حملہ آور اس پر فائزگ بھی کر سکتا تھا۔

وہ جلد ہی اس کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن حملہ آور کو بھی اتنی مہلت مل گئی کہ وہ ایک بڑا سا چاقو کھوں لیتا۔ حمید کاریوں اور توہا تھے سے نکل کر نہ جانے کہاں جا پڑا تھا۔ شاند وہ چاقو نہ کھوں سکتا۔ اب اسے خالی ہاتھ اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ لیکن کم جنت کافی۔ اس کا پیدا ایک بار پھر پھسل گیا۔ نہیک اسی وقت حملہ آور نے بھی اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن حمید نے گرتے گرتے اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہ نیچے تھا اور حملہ آور اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا چاقو گھونپ دینے کے لئے زور کر رہا تھا۔ حمید نے دونوں پا تھوں سے چاقو والا ہاتھ پکڑ کر ایک زور دار جھکٹے

”یہ یہ.... کار تو سارہ کی معلوم ہوتی ہے۔“ حمید ہکلایا۔
”ہاں اسی گاڑی پر وہ کو توہا سے بروانہ ہوئی تھی۔ میں اپنی یادداشت پر شبہ نہیں کر سکتا۔ تم بھی ہی تھے۔ اور.... یہ کیا۔“

کتنے نے بھی یکفت اپنی اچھل کو ختم کر کے کان کھڑے کئے۔ فائزگ کی آواز حمید نے بھی سن تھا۔ لیکن وہ قریب سے نہیں آئی تھی۔ پھر پے در پے کئی آوازیں آئیں اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ کتنے نے پہلے ہی اسی سمت جانے کے لئے زور کیا تھا جو حمید سے آوازیں آرہی تھیں۔

”کریپ...!“ فریدی نے کتنے کا سرز میں پر جھکاتے ہوئے کہا۔ کہاں میں پے لگ کر اس کی طرف مڑا۔

”گو... کریپ...!“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور خود بھی ریگنے ہی کی پوزیشن میں آگیا۔ آہستہ آہستہ ریگنے ہوئے وہ آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ حمید کو کتنے پر حیرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اسی طرح رینگ رہا تھا اور ان کے آگے تھا اور یعنی طور پر آواز ہی کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔

رہ رہ کر فائزگ ہو رہے تھے اور بذریعہ آوازیں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ کتنے کی رفتار پہلی ہی جیسی تھی۔ بھی بھی وہ مڑ کر اس انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگتا تھا جیسے دوسرے حکم کا منتظر ہو۔ ”دیکھو...!“ یک بیک فریدی نے زمین سے چپک کر رہا گیا۔ شاند و سری گولی اس کا خاتمه ہی کر دیتی اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ حمید بھی جہاں تھا وہیں رک گیا۔

دونوں گولیاں باہمیں جانب سے آئی تھیں۔ پھر یک بیک دائمی طرف سے بھی تینیں فائز ہوئے لیکن اب وہ گولیوں کی زد پر نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دو مخالف پہاں آپس میں مکار گئے ہوں۔

”کیا خیال ہے۔“ حمید نے آہستہ پوچھا۔ ”ہم شبی میں ہیں اور کسی وقت بھی نشانہ بن سکتے ہیں۔ غالباً انہوں نے ابھی ہمیں دیکھا نہیں ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے۔“ ”تم دائیں جانب والوں کی پشت پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں باہمیں طرف دھکتا ہوں۔“

عراقا کے جان بچانے کے لئے جدوجہد بھی نہ کر سکتا۔ ریو اور اس کے ہاتھ سے ضرور نکل گیا تھا لیکن وہ تو غافل نظر آزہا تھا اور وہ یہ معلوم نہ تھا کہ جان چھڑا کر نکل بھاگنا چاہتا ہے۔ کائی کی پہلی اب بھی حمید کے لئے مصیت نی ہوئی تھی۔

یک بیک اوپر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں اور اس آدمی نے حمید سے پہنچا رپا نے کیلئے جدوجہد تیز کر دی۔ اس وقت وہ دونوں ہی خطرناک پوزیشن میں تھے۔ بس ذرا ہی غفلت کسی کو بڑی گہری ڈھلان میں لے جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں ہائیکس اس حشر ہوتا۔

جیسے ہی چڑاں کے سرے پر بکھ لوگ نظر آئے حمید نے اسے ڈھلان میں دھلینا چاہا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ ہی نیچے لیتی چل گئی۔ دوسرا آدمی اس کی گرفت بتے نکل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے جیسے ہی اسے ساتھ ہی نیچے لیتی چل گئی۔

گر اسے اتنا ہوش چھپا تھا۔ اسکے متعلق پتیاں اس کا انعام ہی معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ سی طرح اپنی ہی جان فتح جائے۔ کتنی براہبرے ہوئے پھر اس کے ہاتھوں میں آئے لیکن وہ انہیں اتنی مضبوطی سے نہ پکڑ سکا کہ لڑھنے کی رفتار میں کی ہی واقع ہوتی۔

پھر یک بیک ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کہ ہی ثوٹ کر رہا جائے گی۔ وہ کس چیز سے انک کر کمان کی طرح جھوول گیا تھا اس کے ہاتھ اضطراری طور پر اس چیز پر جا پڑے۔ یہ ڈھلان پر اگے ہوئے کسی درخت کا پتلا ساتھا تھا۔ اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر بمشکل تمام سیدھا ہوا۔ ایک آدمی مٹت تک تو اسی کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے یا اگر وہ کمزور سا درخت بھی جس سے اکھر گیا تو کیا ہو گا جس سے وہ چھتا رہا تھا۔

وہ اس وقت چونا کہ جب اس نے کتنے کے بھونکنے کی آواز سنی۔ سب سے پہلے اس نے سر اٹھا کر اس بلندی پر نظر دروڑائی جس سے لڑھتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن وہاں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اب نیچے نظر دروڑائی اور اطمینان کی سانس لی۔ وہ سڑک زمین سے صرف پانچ یا چھٹ کی بلندی پر تھا۔ کتاب قریب ہی کہیں متواتر ہو گئے جا رہا تھا۔ لیکن وہ آپی حمید کو کہیں نظر نہ آیا جس سے لڑتا ہوا وہ ڈھلان سے پھلا تھا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اس کے آدمیوں نے اسے اپنی سنبھال لیا ہو۔

وہ کراہتا ہوا نیچے اتراد سارے جسم میں سوزش ہو رہی تھی۔ اب کتنے کی آواز کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑا۔ لیکن اب وہ بہت زیادہ محظاٹ ہو گیا تھا کیونکہ ریو اور بھی پاس نہیں رہا تھا۔

کے ساتھ کروٹ لی اور حملہ آور نیچے چلا گیا۔ چا تو والہا ہاتھ دوسری طرف زمین سے جاگا اور یہ نے بائیں کلائی اس کی گردان پر رکھ دی۔

پھر حملہ آور کو اٹھنا نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی گردان پر حمید کی کلائی کا باہم لجڑے بہ لحظہ برھٹاہی جا رہا تھا۔ چا تو پر اس کی گرفت ڈھنیلی ہو گئی۔ حمید نے داہمہ ہاتھ کو جھینکا دیا اور چا تو دور جا گرا ”کون ہو تم...؟“ حمید آنکھیں نکال کر غرایا۔

لیکن اچانک اوپر سے فائز ہوا اور گولی سامنے والے درخت کے تنے سے نکل رہا۔ حمید کو چٹان کی طرف چھلانگ لگانی پڑی۔ اسی طرح وہ اوپر سے آنے والی گولیوں سے فیکھتا تھا۔ شائد حملہ آور کے لئے بھی یہی مسئلہ تھا۔ ورنہ وہ بھی کیوں حمید کی تقیید کرتا۔ لیکن شائد اس کے ستارے گردش ہی میں آگئے تھے۔ جیسے ہی اس نے چٹان کی طرف رخ کیا اوپر سے آنے والی گولی اسے چاٹھ ہی گئی۔

حمد خود تو گولیوں سے محظوظ ہو گیا تھا لیکن حملہ آور کی موت نے اسے ہمی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ فائز گ کرنے والوں میں سے نہیں تھا مگر نہیں۔ وہاں تو شائد دوپار یاں برس پیکار تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق مختلف پارٹی سے رہا ہوا اور وہ بھی حمید ہی کی طرح اپنے مخالفوں پر پشت سے حملہ کرنے کی کوشش میں ادھر نکل آیا ہو۔

اب حمید چٹان کے نیچے ہی نیچے رینگ رہا تھا۔ کچھ دور پل کر اپنے اپنا زیو اور پڑا دکھائی دیا۔ لیکن فالصل اتنا زیادہ تھا کہ اسے لازمی طور پر گولیوں کی زد پر آتا پڑتا۔ ویسے اب اوپر سے فائز نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی خطرہ تو باتی ہی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ فائز کرنے والا بھلا وادے کر موقع کا منتظر ہو۔

یک بیک اگلے موڑ سے ہلکی سی سر سراہٹ کی آواز آئی اور حمید تیزی سے ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ ایک آدمی چٹان کی طرف منہ کے ابھرے ہوئے پھر وہ پر پیٹ رکھتا نیچے اتر رہا تھا۔

حمد نے نہایت اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناگ پکڑ لی اور پھر پہلا ہی جھنکا اسے نیچے لے آیا۔ لیکن گرتے گرتے بھی اس نے فائز جھوک ہی مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں نشانہ خطاہی کرتا۔ حمید کا ہاتھ اس کے ریو اور والے ہاتھ پر پڑا۔ لیکن گرنے والا نستے بے شکن سے نہیں

تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر تکتی کی غراہٹ سنی اور چونک کرمزا۔
”اوہ....!“ آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی کیونکہ سب سے پہلے اُس کی نظر سارہ ہی پر پڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک آدمی تھا جس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور فریدی سب کے پیچھے تھا۔

سارہ جید تک قریب پہنچ کر رک گئی۔

”اوہ...! بُوئی چوٹیں آئی ہیں آپ کے۔“ اُس نے کہا۔
”اور میرا پرس بھی کہیں گر گیا ہے۔“ جید نے تشویش کرنے لیجھ میں کہا۔ ”میا آپ کے پاس رسید بک موجود ہو گی۔“

”چلتے رہو۔“ فریدی نے کہا۔ لیکن قیدی بھی رک گیا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”مجھ پر زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ لڑکی جھوٹی ہے۔ میں یہاں شکار کھیل رہا تھا۔ یہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں اُس کی مدد کروں پکھ آدمیوں نے اُسے گھیرا ہے۔ میں اس کے لئے سینہ پر ہو گیا وہ کئی تھے۔“

”یہاں نہیں۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”جو کچھ بھی کہنا ہو تھی کوارٹر میں کہنا۔“
”میں تو نہیں جاؤں گا۔“

”مجھے اس پر مجبور نہ کرو کہ میں تمہیں اسی کتکتے کے حوالے کر دوں۔“
”نہیں۔“ اُس نے خوفزدہ نظروں سے کتے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ چلتے رہا۔ اور وہ درے سے نکل کر اونچی چنانوں کے درمیان آگئے تھا۔ لیکن اس حصہ سے نکلنے کے لئے اُسیں بہر حال ایک بڑی چڑھائی طے کرنی پڑتی۔
کیک بیک کتا حلقت پھاڑنے لگا اور سامنے سے ایک فائر ہوا وہ سرے ہی لمحے میں قیدی زمین پر پڑا ایساں رکڑ رہا تھا۔

فریدی نے بڑی پھرتی سے سارہ اور حید کو ایک چمن کے پیچھے دھکیل دیا اور پھر حید نے محسوس کیا کہ فریدی بھی فائر کر رہا ہے۔ اُس نے شائد کتنے سے بھی کچھ کہا تھا۔
”اب کیا ہو گا۔“ سارہ نے کامیٹے ہوئے کہا۔ ”پھر ہی مصیبت... اے... دو دلکھتے“
حید نے سر اچھار کر دیکھا۔ بلند ہاؤڈ شائد حملہ آور نکل پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ ایک چمن کے

پکھ دوڑ پل کر دیکھنے سے درے میں داخل ہوا کتے کی آواز اُدھر ہی سے آرہی تھی اور اب اتنی قریب تھی کہ درے میں اس کی گونج کی جھنکاریں بھی محسوس ہونے لگی تھیں۔

پھر وہ اُسے نظر بھی آگیا۔ شائد کسی غار کے دہانے میں گھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر بار کسی را نکل کا کندہ باہر نکل کر اُس کے سینے سے نکلا تا اور وہ پھر اچھل کر پیچھے ہٹ آتا۔

حید رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو کوئی بھی ہے صرف را نکل ہی رکھتا ہے۔ در تو اس ختم ہو چکے ہیں ورنہ اب تک اُس نے کتے کو زندہ کیوں چھوڑا ہو تا اور پھر ہو سکتا ہے یہ وہی آدمی ہو جس کے لئے کتابیاں لایا گیا تھا۔ ورنہ یہاں تو فائر گن ہو رہی تھی۔ در جتوں جو می مختلف اطراف میں بکھرے رہے ہوں گے۔ پھر وہ خصوصیت سے کسی ایسے آدمی کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا جس کے پاس اب اپنی جان بچانے سے لے بھی کارتوس باقی نہیں رہتا۔

وہ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہا۔ کتنے نے اسے دیکھ کر اور زیادہ جوش سے جملہ شروع کر دیا تھا۔ یک بیک کوئی چیز اُس کی پشت پر لگی اور وہ چونکہ کرمزا تھوڑے ہی فاصلے پر فریدی ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ حید پھر واپس ہوا۔

”تم درے کے دہانے پر ٹھہر و ریوالز کیا ہوں۔ اوہ...! یہ کیا حالت ہے تمہاری۔“ اس نے اُسے پہنچ سے اوپر نکل دیکھا۔

”میں خالی ہاتھ ہوں۔“ حید نے جواب دیا۔

”یہ لو...! دیں ٹھہر و ریوالز کے اپاریو اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ حید بھنا کر رہ گیا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ چپ چاپ ریوالز کے درے کے دہانے کی طرف چل پڑا۔ پہنچ نہیں وہ سب فائر گن کرنے والے کہاں غائب ہو گئے تھے اب تو چاروں طرف نشانہ سناتا تھا۔

درے کے دہانے نکل پہنچنے پہنچنے کتے کی آوازیں آئیں۔ آئی بھی یہندہ ہو گئیں۔

وہ ایک پھر سے نکل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس تھوڑے سے دقت میں اس پر جو کچھ گذری تھی ایک عمر کی کہانی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن فریدی تو بالکل ہی ترو تازہ نظر آیا تھا۔ کیا اُس کی کسی سے بھی مل جھیز نہیں ہوئی تھی؟ پھر یہ سارا بہگامہ خود بخود کیے فرو ہو گیا؟ چمن کے اوپر سے فائر گن کرنے والے کیوں بھاگے تھے!

ڈیڈی کی تشوہ وار

جید کو اس کا ہوش نہیں تھا کہ شہر پہنچنے کے بعد وون کا بقیہ حصہ کیسے گزرا تھا۔ پولیس ہپتال میں اس کے زخمی اور خراشوں کی ڈرینگٹ کیا تھی اور وہ آب وہیں آرام کر رہا تھا۔ سارہ کو بھی پولیس ہپتال میں ہمیں رکھا گیا تھا۔ گودہ بالکل محفوظ رہی تھی لیکن فریدی کے اس خیال سے ڈاکٹر کو بھی متفق ہوا پڑا تھا کہ غیر متوقع ذہنی جھکلوں نے اس کے اعصاب پر بھی نہ اثر دالا ہے اس لئے ابھی آرام کرنا چاہئے۔ سارہ نے اس پر شدت سے احتیاج کیا تھا لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔

فریدی نے جید کو اس کے متعلق کچھ ہدایات دی تھیں جن پر وہ شام سے پہلے عمل نہ کر سکا! کیونکہ اس کا خیال تھا کہ لا اتنی بھڑائی سے زیادہ تر ہانسنے پر برا اثر پڑتا ہے اور معدے کے انجرات ایسی صورت میں عموماً ماغ ہی کی طرف ہوتے ہیں اس لئے ذہنی پر اگدگی پر بے ہوشی کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے اور اسے بیویوں ہی کہیں گے کہ آدمی کوئی ڈھنک کی یات سوچنے کے قابل نہ رہ جائے تقریباً چھ بجے سارہ جید کے کمرے میں آئی۔ جید نے اندازہ کر لیا کہ وہ بہت زیادہ بوریت

”میں پہنچنے اور پروفسر کے لئے مخلکات پیدا کر رہی ہو تھی۔ تمہارے لئے اس وقت دوپار نہیں کے درمیان بڑی خوب آشام جنگ ہوئی ہے۔“
”میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“
”ڈاکٹر داؤد سے تم لوگوں کے کیسے تعلقات تھے۔“
”بس یونہی رسمی سے۔ مگر آپ نے ڈاکٹر داؤد کا تذکرہ کیوں چھیڑا ہے۔“
”سچھ نہیں! میں اب اس سلسلے میں تم سے کسی قسم کی گفتوں نہیں کروں گا۔ لیکن اسے یاد رکھنا کہ تم ہر وقت خطرے میں ہو۔“
”بڑی مصیبت ہے۔“
”چلتی رہو! مجھے اس پر بھی یقین نہیں ہے کہ پروفیسر غوری وہی شخص ہے جسے تم ڈیڈی کہتی ہو۔“
”ہاں میں....!“ سارہ کسی بت کی طرح برداشت ہو گئی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

پیچھے بار بار راکفل کا کندہ بلند ہو رہا تھا اور کہتے کی غریب ہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ جملہ آور تھا ہی ہے۔ حمید پھر خالی ہاتھ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے چٹان کے پیچھے دھکیتے وقت فریدی نے اس کے ہاتھ سے روپا اور بھی لے لیا تھا۔
”آپ پچھے نہیں کر رہے۔“ سارہ نے کہا۔

”میں صبر کر رہا ہوں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“
پھر یہ یہکہ بھی اسی چٹان کے پیچھے نظر آیا۔ جملہ آور راکفل کو لٹھ کی طرح گھمارہ تھا۔ ٹھنڈہ باہم نے کی بار اس پر چھلانگ لگائی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔
عمل آور غالباً مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے وہیں سے ایک گھری کھنڈ میں چھلانگ لگادی اور اس کی کریبہ جیخ سے جنگل میں سانالرز اخما۔ اتنی اوپرائی سے گر کر بچ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔
ٹھوڑی دیر بعد فریدی کہہ رہا تھا ”کتنا وابیات دن ہے دونوں میں سے ایک بھی نہیں بچ سکا۔ اب پھر اندر ہرے میں ہاتھ پیر مارتے پھر د۔“
وہ پڑھائی پر چل رہے تھے لیکن حمید کو توقع نہیں تھی کہ صحیح راستے پر لگ سکیں۔ خود ان کو قلعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس راستے سے آئے تھے اب شام کو اس چٹان کی بھی نشان دہی نہ کر سکتا جس کے پیچے اس نے دو آدمیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

”یا ہم وہاں تک پہنچ سکیں گے جہاں سارہ کی کار دیکھی تھی۔“ حمید نے کہا۔
”فکر مت کرو۔ ہم وہیں پہنچیں گے۔“ فریدی نے جواب دیا۔
”آن کار دن مجھے زندگی بھریا رہے گا۔“ سارہ بڑا بڑا۔
”انہوں نے تمہیں کیوں پکڑا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔
”آئی کم بخت بچے کے متعلق پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہے؟“
”کیا جسمیں یقین ہے کہ تم بچے بولی رہی ہو۔“

”کیوں؟ بھلا میں جھوٹ کیوں بولنے لگی۔ پھر ایسی صورت میں...!“
”عادت ہی ٹھہری! جھوٹ بولنے کے لئے صرف زبان ہی ہلانی پڑتی ہے۔“
”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔“

"میرا خیال ہے کہ کرٹل سے زیادہ بھائیک آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ انہوں نے اس آدمی کو گرون سے پکڑ کر اسی طرح لٹکایا تھا جیسے کسی خرمگوش کو کوئی شریر پچھا اٹھا کر جھولے دینے لگے۔"

"آپ کو یہ حرکت مطلقاً پسند نہ آئی ہو گی؟" حمید نے سوال کیا۔
"اوہ... مزہ آگیا تھا۔ ہلا۔" وہ نفس پڑی۔ "کچھ درپہلے وہ کم بخت کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے اسے پچھے کی اصلیت نہ بتائی تو مجھے مارڈا لے گا۔"

"چلو مجھے بھی بتاؤ۔" حمید نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

"جس غریب نے تجربہ کیا تھا وہ تو بتاہی نہ سکا۔ میں کیا بتاؤں گی۔"

دفعہ فریدی کر کرے میں داخل ہوا اور دو دنوں کھڑے ہو گئے۔

"خدار مجھے اس الجھن سے نجات دلائے جناب۔" سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"بیٹھے بیٹھے۔" فریدی ہاتھ ہلا کر بولا اور خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا حمید کی خبریت دریافت کرنے لگا۔

"بس بالکل نیک ٹھاک ہوں یعنی کہ اب آپ مجھے...!"

"خیر... خیر...!" فریدی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور حمید کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اب وہ سارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اپنے ڈیڈی کے غیر متوقع پچھے کے متعلق ایک نئی خبر سنو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی! مراہ کرم مجھے یہاں سے نجات دلائے۔ میں تجربہ گاہ میں واپس جاؤں گی۔"

"حالانکہ وہاں آپ کے لئے خطرات ہی خطرات ہیں۔"

"ہر قسم کی بلا میں آپ ہی کے لئے ہیں۔ پھر ان سے ڈرنا کیا معنی رکھتا ہے۔"
بات معقول ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی ہی کسی ایسی بلا کی پیدائش کا ذمہ دار ہو جو بوسائی کے لئے واپس جان بن جائے تو تم اس آدمی کے لئے کون سی سزا جھوپیز کرو گی۔"

"میں کہتی ہوں ڈیڈی پاگل نہیں تھے کہ اپنا نفع نفسان نہ سمجھ سکتے۔" سارہ نے کہا پھر دفتہ چوک کر تھیز انداز میں فریدی کی طرف دیکھا۔ "ہاں ذرا نیچے تو بتائیے آپ نے کس بناء پر یہ کہا تھا

محوس کر رہی ہے۔ ویسے خوف وہ راہیں کی پر جھائیں تک اُنکے چہرے پر نہیں دکھائی دی تھی۔
"میں پاگل ہو جاؤں گی۔" اُس نے کہا۔

"اوہ! یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ میری نظروں میں ترقی کی معراج یہی ہے۔"

"میرا مذاق نہ اڑائیے۔" سارہ جلا گئی۔ خواہ مخواہ مجھے بھی مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیا ہوا ہے بھی؟ اُذکر کہتا ہے اعصاب پر برا اثر پڑا ہے! میں تو کچھ بھی نہیں محوس کرتی۔"

"محوس نہ کرنے کی وجہ ہے۔" حمید مسکرا یا۔ "اگر ہم لوگ ٹھیک وقت پر نہ پہنچ ہوتے۔"
"تو کیا ہوتا! موت ہی آتی تا۔"

"مگر وہ تمہیں وہاں لے کیسے گئے تھے۔"

"کرٹل کو بتا بھی ہوں۔" سارہ نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ "بس حماقت ہی تھی کہ اس چکر میں پھنس گئی۔ جھریاں والی سڑک عموماً سنسان پڑی رہتی ہے۔ وہ سڑک پر اونڈھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے بوکلا کرنے صرف گاڑی روک دی بلکہ خود بھی اتر آئی۔ وہ یک بیک اٹھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں ڈر گئی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں چپ چاپ گاڑی کی پچھلی سینٹ پر بیٹھ جاؤں۔ میں نے الیاہی کیا۔ چاروں طرف سنا تھا۔ جیسے ہی میں اندر بیٹھنے لگی۔ اُس نے پستول کا ذستہ میرے سر پر رسید کر دیا۔ چوتھی شدید تھی کہ میں چکرا کر پچھلی سینٹ پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر ہوش نہیں رہا کہ کہاں اور کس حال میں ہوں۔ ہوش تو اُبی غار میں آیا تھا۔"

"مگر وہ تھوڑی کی پہاڑیوں میں تھا تو نہیں تھا۔ درجنوں آدمی تھے۔"

"رہے ہوں گے۔ میں کیا جانوں! اوہ... میری بھجھ میں نہیں آتا آخر کرٹل نے یہ کیوں کہا تھا کہ انہیں ڈیڈی کے وجود پر شہر ہے۔"

"وہ بعض اوقات اپنے وجود پر بھی شبہ کرنے لگتے ہیں۔ گاہ کہتے ہیں کہ ہیں گاہ یہ کہتے ہیں نہیں۔ اب بھی پچھلے ہی دنوں کھانے کی میز پر لطیفہ ہوا تھا۔ پیٹھ اٹھا کر کرسی پر رکھ دی اور پیٹھ کی جگہ خود بیٹھ گئے۔ پھر اسی وقت انہیں اپنے نوجوان کا احسانی ہوا تھا جب میں نے ان کی ران میں فور کچھا کر چھری چلانی چاہی تھی۔"

"آپ ایس طرح مصلحہ ادا تھے ہیں کرٹل کا آپ کو ان سے خوف نہیں معلوم ہوتا۔"
"خوف... کمال کر دیا آپ نے اسے خوبصورت لوگوں سے کہیں خوف بھی کھلا جاتا ہے۔"

”نہیں... نہیں... مجھے فوج کے ساتھیوں کی طرح کے ادارے میں لے چلے۔ خدا کے لئے دیرینہ سمجھتے۔ ڈیڈی خطرے میں ہیں۔“

”لیکن آپ وہاں کیوں جانا چاہتی ہیں کوئی بھی چلنے میں آپ کو دکھاؤں کہ پروفیسر محفوظ ہیں۔“

”وہ ڈیڈی نہیں ہیں ہیں... وہ ڈیڈی نہیں ہیں۔“

حید کامنہ حیرت سے کھل گیا۔

”تو پھر مجھے وہاں لے چلے جہاں آپ کے ڈیڈی تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”چلے... جلدی سمجھے۔ یہ خدا وہ زندہ ہوں... باخدا۔“

وہ دونوں چلے گئے تھے۔ حید بیٹھا ہی رہ گیا۔ فریدی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دونوں کہاں گئے ہوں گے۔

حید اب اس کے متعلق سوچ رہا تھا جسے سارہ نے اپنا ”ڈیڈی“ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن کچھ دیر پہلے اسے بہر صرف ”ڈیڈی“ بلکہ کریک بھی ثابت کرتی رہی تھی۔ پھر یہ بیک کسی دوسرے ڈیڈی کے لئے بہر پہنچنے لگی۔ لیکن یہ تبدیلی اُسی وقت ہوئی تھی جب فریدی نے اس مشنی بچے کے متعلق ایک نئی خبر سنائی تھی۔ گویا اس سلسلے میں وہ بچہ اتنا ہی اہم نہیں تھا جتنا کہ اس کے گرد چکرانے والا چمکیلا غبار ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بچے کے تذکرے توہہ پہلے بھی سنتی رہی تھی۔

بہر حال ان لوگوں اور ڈاکٹر داؤد کے درمیان کوئی گہرا اعلان تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے کہ اس کا قتل بھی کسی نہ کسی طرح انہیں لوگوں سے متعلق ہو۔

اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔ اتنا خمی بھی نہیں تھا کہ تجسس کی اس لمبڑی کی ضرورت پیش آتی جوان غیر متوقع حالات میں اچانک پیدا ہوئی تھی۔

ہسپتال میں مریض کی حیثیت سے تو داخلہ ہوا نہیں تھا کہ باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش آتی۔ بس ڈرینگ کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں جایا تھا۔

باہر آتے وقت کوئی آدمی بھی نہیں ملا جو سماں اُسے مزید آرام کی اہمیت سمجھا سکتا۔ تیکسی جلد ہی مل گئی۔ اس نے ڈرائیور کو پروفیسر غوری کی کوئی بھی کاپٹہ دیا۔

اندھیرا اچھل کا چکا تھا۔ شہر کی بھرپوری پر کہیں جگہ کا اٹھی تھیں۔

حید کو یقین تھا کہ سارہ فریدی کو اس کی کوئی بھی کی بجائے کہیں اور بے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ

”میں اس وقت ڈیڈی پر نہیں ہوں۔“ حید بڑا کر خاموش ہو گیا۔ ویسے وہ نہایت سمجھدا تھا ”مقدس سارہ“ پر غور کر رہا تھا۔ فریدی کے خیال کے مطابق اگر الو کسی شخصیت کی تصور والہ تشكیل تھا تو مقدس اور سارہ بھی صوتی اعتبار سے ڈاکٹر کو مثلث اور دائرہ یاد دلا سکتے تھے۔ بالکل اسی طرح چیز لفظ چند رکا خیال آتا ہے اور نمرود کے نام پر زبان امر د کا ذائقہ محصور کرنے لگتی ہے۔

وہ پھر اُن دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سارہ فریدی سے کہہ رہی تھی۔ ”آخر اُپ اس کے متعلق کون سی نئی خبر سنانے والے تھے۔“

”بہت بُری۔ پروفیسر کے ہاتھوں میں باقاعدہ طور پر ہٹھڑیاں پڑ جائیں گی۔“

”آپ خواہ نجواہ مجھے نزوں کر رہے ہیں۔“

”اُس نے آج ایک بینک کولوٹ لیا۔“

”میرے خدا....؟“ سارہ کامنہ حیرت سے کھل گیا۔

”اور پھر جس وقت اُس پر فائز کئے گئے تو وہ جم کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔“

”مرا نہیں....؟“ سارہ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

”اُس کے گرد چمکدار غبار سا گردش کر رہا تھا۔ سر سے پیر تک.... گولیاں اُس سے کتر اکر نکل جاتی تھیں۔ پھر جب وہ بھاگا تو غبار بھی اُس کے گرد چکراتا ہوا ساتھ ہی متحرک ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ چھلانگیں لگاتا تھا تو غبار اُس کے ساتھ اور پر بھی اٹھ جاتا تھا۔“

”ڈیڈی....!“ سارہ پا گلوں کی طرح چمنی اور پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ فریدی نے جھپٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چھوڑیے.... مجھے چھوڑ دیجئے۔“ وہ برا بر چھیتے جا رہی تھی۔

حید بھی بوکھلا کر بھی کو دپڑا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ڈیڈی کے پاس.... ڈیڈی۔“ وہ کسی نہیں بی بچی کی طرح بھوٹ بھوٹ کرو نے لگی۔

”خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے۔ ڈیڈی کی زندگی میں تو یہ ناممکن تھا۔“

”وہ محفوظ ہیں۔ اپنی کوئی میں ہیں۔ وہاں پولیس کا پہرہ ہے۔“

کے پانچ سور و پے ماہوار کا ملازم ہوں۔“

”کس نے ملازم رکھا تھا۔“ دوسری آواز آئی۔

”ڈاکٹر دادو نے۔ اُس نے مجھے مکرم علی سے پروفیسر غوری بنا دیا تھا۔ سارہ مجھے ڈیمی کہتی ہے لیکن بالکل الوکا پڑھا کہجھتی ہے.... میں کیا کروں۔ پہلے پچھلے نکلا اور چانتے مار مار کر میری کھوپڑی خالی کر دی اور اب یہ مصیبت۔ پستول... بج... جیب میں رکھ لو پیارے بھائی۔ یہ دیکھو میں تمہارے حکم سے کتنی آہنگی سے گفتگو کر رہا ہوں۔ میری آواز باہر نہیں جاسکتی۔ اب تم بھی رحم کر دو۔“

”تو تم نہیں جانتے کہ پروفیسر غوری کون ہے۔“

”نہیں پیارے بھائی بالکل نہیں۔ میں نے تو آج تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں کسی قسم کی چھان میں نہ کروں ورنہ مجھے اس ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“
”اچھی بات ہے۔ میں ابھی پھر واپس آؤں گا۔ لیکن اگر تم نے میرے بارے میں کسی سے تذکرہ کیا تو تمہاری کھوپڑی میں کئی سوراخ ہو جائیں گے۔“

”ارے نہیں! بالکل نہیں۔ یقین سمجھے کسی سے بھی نہیں کہوں گا۔“

حمدیہ ایک طرف ہٹ گیا۔ دروازہ کھلا اور باہر سر نکلنے والے کی ناک پر اُن کا بھرپور ہاتھ رہا تھا کہ حمید نے اُس پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ مغلوب پڑل وہ اچھل کر کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر شائد وہ پستول ہی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا کہ حمید نے اُس پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ مغلوب اُسے گردابیے کے لئے زور کرنے لگا تھی دیر میں حمید اس کی جیب سے روپ اور بھی نکال چکا تھا۔ ”نہیں جیری! مشکل ہے۔“ حمید نے اُسے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”تم پہلے بھی کئی بار میرے ہاتھوں پٹ پکھے ہو۔“

”میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ جیری ہانپتا ہوا بولا۔ حمید نے اس کی بیٹھانی پر روایاد، دوستہ سید کر دیا۔ ناک سے تو خون بہہ ہی رہا تھا بیٹھانی کی کھال بھی پھٹ گئی۔

”ہاں اب بتاؤ! تم کسی سفارتخانے کے لئے کام کر رہے ہو یا موچھر اولیٰ عینک۔ لئے۔“

”خاتر ہو گیا۔“ جیری کی پھر ہمیں آواز میں بولا اور اُس کے ہاتھ ہیڑھیسے پڑ۔ حمید نے پھر دو تین رگڑے دیے اور جیری کو زبان کھولتی ہی پڑی۔

جب اس کو ٹھی میں قیام کرنے والا اُس کا ”ڈیمی“ تھا ہی نہیں تو وہ وہاں کیوں گئی ہو گی! وہ تو اپنے ڈیمی کے لئے پریشان تھی۔ لہذا حمید نے سوچا کہ کیوں نہ اُسی آدمی سے پوچھ چکھ کی جائے جسے ابھی تک اپنا باپ نہایہ کرتی رہتی تھی۔ جب وہ اپنی ذمہ داری پر کسی کام میں ہاتھ لگاتا تھا تو اُس کی کھوپڑی عموماً کار آمد ہی ثابت ہوتی تھی۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ کمپاؤنٹ کے چھانک ہی پر رکے گا لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں ان لوگوں کی کار کردار کی احتجاج بھی کر لیا جائے جو کوئی ٹھیک نگرانی کر رہے تھے۔

پروفیسر غوری پولیس کی نگرانی میں تھا۔ یہ فریدی ہی کی تجویز تھی کہ اُسے معمولی حالات کی بجائے اس کی کوئی ٹھیک ہی میں مقید کر دیا جائے۔ لہذا کوئی ٹھیک کی کمپاؤنٹ میں کچھ پولیس کا نشیل ایک اسے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ موجود تھے۔

حمدیہ نے ٹیکسی کو ٹھیک سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر رکوائی اور چھانک کی طرف جانے کی بجائے کوئی ٹھیک کی پشت پر آیا۔ کمپاؤنٹ والی پانچ یا چھٹے سے زیادہ اوپری نہیں تھی۔ بے آسانی پار کی جاسکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمپاؤنٹ میں تھا۔ کمپاؤنٹ کا یہ حصہ تاریک اور سنان نظر آیا۔ اُس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا تھا کہ نگرانی کرنے والے چھانک ہی کی طرف ہوں گے۔

اب اُس نے سوچا کہ کسی طرح ان کی لا علی میں عمارت کے اندر بھی پہنچنا ہی چاہئے تاکہ جواب طلب کرنے میں کسی قسم کی پچکاہت بھی باقی نہ رہے۔

اُس میں کوئی دشواری نہ ہوئی کیونکہ ایک چھوٹا سا عقبی دروازہ اسے کھلا ہوا ملا لیکن اُسے یہ بھی نہ سوچنا پڑا کہ کہیں پروفیسر نگرانی کرنے والوں کو ڈھونکے میں رکھ کر اسی طرف سے فرار نہ ہو گیا ہو۔ وہ دبے پاؤں چلتا رہا۔ پھر دفعتاً اسے ایک جگہ رک جاتا پڑا۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن روشنداں کے شش تھے اور اندر کوئی دبی ہوئی آواز میں گھمگھا رہا تھا۔

”دیکھو.... مجھے مارنا ملت۔ نہیں نہیں۔ کچھ نہیں جانتا۔ میں سائنسٹ نہیں ہوں میں تو بالکل گدھا ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ لڑکی کم بخت مجھ سے ائے سیدھے جربات کرایا کرتی تھی۔ ہاں سارہ...“ پھر ڈاکٹر ڈھرناگ نے شتر مرغ کا پچھے نکالنے کا مشورہ دیا۔ میں نہیں جانتا کہ اُدمی کا پچھے کیسے نکل آیا تھا۔ خدا کے لئے یہ پستول جیب میں رکھ لو۔ میری سنو۔ یہ پچھے.... یہ پچھے سارہ کی شرارت ہے۔ اُس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو آخر سال

”نبیں میں خائن نہیں ہوں۔ مجھے بہر حال کی نہ کسی بد نصیحتی کا سامنا کرتا ہی پڑے گا۔“
”ضروری نہیں ہے۔“

”مگر ڈیڈی کی زندگی میں یہ نامکن تھا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ کپاٹ میں داخل ہوئے۔ کچھ دور چل کر ان کا بھی چوکیدار بیویش پڑا
مالبر آدمے میں بھی تم کا نشیل ڈھیر نظر آئے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی خواب آور گیس سے کام لیا گیا ہو۔“ فریدی بربرا یا۔
وہ اندر داخل ہوئے۔ فریدی نے محدود روشنی والی نارنج روشن کری تھی۔ عمارت کے کسی
جھیٹ میں روشنی نہیں نظر آ رہی تھی۔

جیسے ہی وہ راہداری کے سرے پر پہنچ فریدی کے شانے پر کوئی سخت سی چیز لگی لیکن
دسرے ہی لمحے میں حملہ آور کا ہاتھ اُس کی گرفت میں تھا۔ پھر اتنی پھرتی سے اُس نے اُسے
پشت پر لاد کر پٹخانہ کے اس کی آنکھوں میں تار۔ ہی ناج گئے ہوں گے۔ ”جگرگئی تھی۔“
نے جھپٹ کر اُسے اٹھایا۔

فریدی حملہ آور کے سینے پر سوار اُس کی کنٹیاں دبارہ تھا اور وہ اس طرح کراہ رہا تھا جیسے
آہستہ آہستہ اس کی کھوپڑی کی ٹہیاں اپنی جگہوں سے کھبک رہی ہوں۔

سائز تھی انداز میں منہ پھاٹے دیکھتی رہی۔ نارنج کی روشنی مغلوب حملہ آور کے چہرے
پر پڑ رہی تھی۔ اُسکے چہرے پر ایسی تکلیف کے آثار موجود تھے جیسے وہ اعصابی آشیش میں بتلا ہو گیا ہو۔
فریدی نے اُس کی جیبوں کی تلاشی کے کریو اور اور چاقو برآمد کیا۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ لوہے کی وزنی سلانخ فریدی کے شانے پر پڑی تھی۔ حالانکہ نشانہ سر
کی کارہا ہو گا۔ اگر وہ صحیح نشانے پر بیٹھی ہوتی تو خود فریدی ہی حملہ آور کی جگہ لیتا نظر آتا۔
حملہ آور بے حصہ حرکت ہو چکا تھا۔ فریدی اُسے بھیج کر ایک کمرے میں لے گیا۔

”اب جلدی بھی سمجھے۔“ سائزہ بربرا یا۔ ”میرے خدا میں کیا کروں۔“

”میں پھر مشورہ دول گا کہ مجھے وہ جگہ بتاؤ اور خود یہیں ٹھہرو۔“

”میا آپ کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہے۔ کیا آپ بنے میرے بیان پر یقین نہیں کیا۔“

”ذاتی تجربات ہی مجھے کسی امر کا یقین دلاتے ہیں۔ چلو۔!“

”وہ کہاں ہے۔“ حمید نے پوچھا۔
”میرا خیال ہے کہ... وہ اس وقت پروفیسر کی تجویز گاہ میں ہو گا۔ کیپن مجھے چھوڑ دو۔ میں
اُسے گرفتار کراؤں گا۔“
حمدی نے اُس کی بات پر دھیان دیئے بغیر احتق پروفیسر سے کہا کہ وہ باہر نکل کر نگرانی کرنے
والوں کو اندر بلائے۔

آخری معرکہ

فریدی کی کار بڑی تیز رفتادی سے یہاں تک آئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی سائزہ کہتی
رہی تھی۔ ”ایسی رفتار سے تو ہم کبھی نہ بچنے سکیں گے۔“

گڑی تجویز گاہ سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی گئی۔
”جیسے یہاں کون؟“ سائزہ بربرا یا۔

”اعیطا! میرا خیال ہے کہ یہاں کچھ نہ تبدیلیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔“
”آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہاں پر الگا دیگا یا۔“

”ہاں کہا تو تھا۔ مگر سابقہ ایسے لوگوں سے ہے جن کی نظروں میں مٹھی بھر مسلح آدمیوں کی کوئی
وقت نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن آپ تھا آئے یہ۔“
”میں تھا ہی کام کرنے کا عادی ہوں۔“

وہ کپاٹ کے پھانک تک پیدل آئے۔ فریدی کا شبہ بے بنیاد نہیں تھا۔ دباور دی کا نشیل
پھانک کے قریب لبے لبے لیٹھے ہوئے نظر آئے۔

”اوہ... میرے خدا۔“ سائزہ کی آواز کانپ رہی تھی۔
فریدی نے انہیں ہلا جلا کر دیکھنے کے بعد کہا۔ ”صرف بیویش ہیں! اچھا تم مجھے وہ جگہ بتاؤ
خود سیکھو۔“

”نہیں... نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ساتھ چلوں گی۔“
”تو پھر ذروہ بھی مت۔“

سارہ پھر آگے بڑی۔ اس بار فریدی نے تاریخ اُسی کے ہاتھ میں رہنے دی تھی۔ کمی کر دوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسے حصے میں آئے جس پر کسی لوہا کی دوکان کا دھونکا ہوا۔ سکتا تھا چاروں طرف مختلف قسم کے اوزار بکھرے پڑتے تھے۔ سارہ رک گئی۔ تاریخ کی روشنی کی لیکر ایک کٹا ہوئے دروازے میں ریگ گئی تھی۔

”کوئی اندر ہے۔“ وہ کامبی ہوئی بولی۔ ”یہ دروازہ مغلول رہتا ہے اور کنجی صرف میرے علپاں کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے سنبھلنے سے پہلے ہی فریدی کا ہاتھ اُس کے جزوئے پر پڑا۔ ساتھ ہی فریدی نے تاریخ زمین پر ڈال کر اُس پر چلا گئی بھی لگائی۔

”تاریخ اخداو... سارہ۔“ اُس نے نقاب بوش کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ سارہ نے بکھالے ہوئے انداز میں تاریخ اٹھائی۔ فریدی اتنی دیر میں اسے بنے بس کر کے اس کے چہرے سے نقاب ہٹا چکا تھا۔ روشنی پڑتے ہی اُس نے ہنس کر انگریزی میں کہا۔ ”اوہ... آپ ہیں۔ بڑے موقع سے ہاتھ لگے ورنہ آپ پر ہاتھ ڈالنے میں ذرا دشواری ہوتی۔“

”تم کون ہو۔“ مغلوب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اوہ... تم ابھی تک بیری شکل نہیں دیکھ سکتے۔ سارہ ذرا اسے میری شکل دکھاؤ۔“

محدود روشنی والی تاریخ کا روزگار روشن دارہ فریدی کے چہرے پر ریگ آیا۔

”اوہ....!“ مغلوب کرنا اور پھر فریدی کو نیچے گراوینے کے لئے شاہد اپنا انتہائی زور صرف کرنے لگا۔

”یہ کون ہے۔“ سارہ نے کپکاپا تھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اوہ.... ایک بڑے ملک کے معزز سفیر کے فوجی اٹاشی۔“ اُس نے طنزیہ لمحے میں کہا پھر اُس کے منہ پر التاہاتھ رسید کرتا ہوا بولا۔ ”تہہ خانے میں کون ہے۔“

”اک... کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں... نیجروں والی...!“

”ہاں.... ہاں.... کہو خاموش کیوں ہو گئے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھر واللہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے اور تم دونوں ایک دوسرے کو ختم بھی کر دینا چاہتے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نصیری تمہارے لئے کیا کر رہا تھا۔ مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر واڈ کو مجھر واللہ ہی نے قتل کیا تھا۔“

”م..... نیجروں واللہ یہاں موجود تھا۔“ مغلوب ہماپنا ہوا بولا۔ ”میں نے اسے تہہ خانے میں داخل ہوتے بھی دیکھا تھا۔ لیکن پھر نہ تو وہ واپس آیا اور نہ تہہ خانے ہی میں ملا۔“

سارہ پھر آگے بڑی۔ اس بار فریدی نے تاریخ اُسی کے ہاتھ میں رہنے دی تھی۔ کمی کر دوں طرف مختلف قسم کے اوزار بکھرے پڑتے تھے۔ سارہ رک گئی۔ تاریخ کی روشنی کی لیکر ایک کٹا ہوئے دروازے میں ریگ گئی تھی۔ ”کوئی اندر ہے۔“ وہ کامبی ہوئی بولی۔ ”یہ دروازہ مغلول رہتا ہے اور کنجی صرف میرے علپاں رہتی ہے۔“

”ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی اندر بزور ہو گا۔“ فریدی بولا۔ ”ورنہ پھرے زار بیہوش کیوں پائے جاتے اور مجھے ایک آدمی کو کیوں بیہوش کرنا پڑتا۔“

”اوہ کوٹھری میں داخل ہوئے سامنے دیوار پر ایک نحاس اس سرخ رنگ کا بلب روشن تھا۔“ ”کوئی اندر گیا ہے۔ لیکن پھر اُس کی واپسی نہیں ہوئی۔“ سارہ بھرا تھی ہوئی آواز میں بولی ”ورشن یہ سرخ بلب روشن نہ ہوتا۔“

”باتوں میں وقت برداشت کرو۔“ فریدی کا الجھ کی قدر درشت تھا۔ سارہ ذرا اسے بھری طرف بڑھی اور فرش پر اکڑوں پیٹھ کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ پھر یک بیک بلکی سی آواز ہوئی اور کوٹھری کے ایک گوشے میں فرش پر اتنی خلاندوار ہوئی جس سے ایک آدمی بہ آسانی گذر سکتا تھا۔

”ٹھہر و... پیچھے ہٹ آؤ۔“ فریدی نے اُس سے کہا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔ ”تمہارے بیان پر یقین کر لینے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

سارہ نے فوراً ہمیں جواب دیا۔ لیکن فریدی اُس کی چڑھتی ہوئی سانوں کی آواز صاف سن رہا تھا۔ دفتارہ بولی۔ ”اس پر بھی غور کیجئے جتاب کہ میں اس بیان کے ساتھ آپ سے مدد کی طالب نہیں ہوئی تھی۔ آپ خود ہمیشہ تشریف لائے ہیں۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔“

”ٹھہر و...!“ فریدی اُس کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے بولا۔ ”اوہ ہٹ آؤ۔“

اس نے اُس کے ہاتھ سے تاریخ لے کر بھاولی۔ فرش کی خلااء سے الیکی آوازیں آری تھیں جیسے زینوں پر کوئی چڑھ رہا ہو۔ وہ دونوں ہکھک کر دیوار سے جاگے۔ پھر وہ سرخ بلب بھج گیا۔ جو کچھ ذری پہلے دیوار پر روشن نظر آ رہا تھا۔ فریدی نے کوٹھری میں کسی تیرے آدمی کی موجودگی محسوس کی۔ لیکن گھری تاریکی کی بناء پر وہ اسے نہ دیکھ سکا۔ ہو سکتا ہے تہہ خانے سے برآمد ہونے

اب یہاں نہیں مل سکیں گے۔

”اوہ.... تو آپ کا خیال ہے کہ وہ مارڈا لے گئے۔“ سارہ سکی لے کر بولی۔

”نہیں.... قتل کرنے والا لاش کیوں اٹھانے پھرتا۔ وہ نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ یا تو خود نکل گئے ہوں گے یا انہیں کوئی یہاں سے لے گیا ہوگا۔ لے جانے والا اگر قتل کرنا چاہتا تو نہیں قتل کر دیتا کہیں اور لے جا کر قتل کرنا قطعی غیر منطقی اور قاتل کے لئے غیر حفاظ حرکت ہوگی۔“

”پھر اب میں کہاں جاؤں انہیں کہاں ڈھونڈوں۔“

”صبر سے کام لو۔ میں یہاں تھوڑا سا کام کرنا چاہتا ہوں۔“ اُس نے کہا اور پھر تقدیمی کی طرف مڑا۔ ہی تھا کہ سامنے والی دیوار سے لگا ہوا ایک بلب جلدی جلدی جلنے اور بجھنے لگا۔ اس پر سارہ اس طرح اچھل پڑی جیسے اب کسی نئے خطرے سے دوچار ہونے کا مندیشہ ہو۔

”کوئی آرہا ہے.... کسی نے دا ظلے کا راستہ کھولا ہے۔“ اُس نے کہا اور فریدی نے قیدی کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ”اوپر رہداری میں تمہارا ہی کوئی آدمی تھا۔“

”ہاں...!“ قیدی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ بھی بار بار جلنے اور بجھنے والے بلب کو دیکھا۔ لیکن شاید اس کا مقصد اس کی بمحض میں نہیں آیا تھا کیونکہ فریدی اور سارہ کے درمیان اردو ہی میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

فریدی بچھت کر تو زینوں کے قریب پہنچا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ آنے والے کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ لیکن نہ تو زینوں سے قدموں کی آوازیں آئیں اور نہ بلب ہی کی بار بار جلنے اور بجھنے والی کیفیت میں کوئی تبدیلی واضح ہوئی۔

”بہت اچھے۔“ دفعتا تہہ خانے کے کسی گوشے سے آواز آئی اور فریدی کا ہاتھ سیدھا جیب کی طرف چلا گیا اور پھر آواز کی طرف مرتے ہوئے وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔ اعشاریہ تمن آنھ کے روی الور کے دستے پہنچنے کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔

”ریو الور زمین پر گرداد کر ٹل فریدی۔ میراثانہ بھی خطا نہیں کرتا۔“ یہودا لش نے کہا۔ وہ اس وقت اپنے اصل روپ میں تھا۔ یعنی نہ تو اس کی آنکھوں پر غیر معمولی ساخت کی تاریک شیشبوں والی عینک تھی اور نہ ہی ہونٹوں کو ڈھک لینے والی مصنوعی موچھیں۔ بہر حال وہ سو نیصدی الوں معلوم ہو رہا تھا۔

”پھرے داروں کو کس نے یہوش کیا تھا۔“

”ہم نے انہیں یہوش ہی پایا تھا۔“

”اوہ تو یہودا لش ہی پہلے پہنچا تھا۔“ فریدی بڑ بڑا۔

اس نے سارہ کی مدد سے مغلوب کے ہاتھ اُس کی پشت پر باندھے اور اُسے بھی دھکیلہ ہوا تھا خانے میں لایا۔

”ڈیڈی.... ڈیڈی.... ڈیڈی۔“ سارہ پا گلوں کی طرح جیخت ہوئی چاروں طرف دوڑتی پڑی تھی۔

تھا خانہ بہت وسیع تھا جس کی تعمیر پر کثیر رقم خرچ کی گئی ہو گی۔ چاروں طرف مختلف انواع سائنسی آلات نظر آرہے تھے اور یہ یقینی طور پر کسی سائنسدان کی تجربہ گاہ معلوم ہوتی تھی۔

سارہ پر پھر دوڑہ سا پڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ وقت اُسے خاموش کرنے میں بھی صرف ہوا۔ بہت زیادہ زوس نظر آرہی تھی۔ فریدی نے قیدی سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ تم نے مجھ وائلن کو واپس ہوتے نہیں دیکھا تھا۔“

”مجھے یقین ہے اور کھو کر مل کیا تم اس معاملے کو یہیں ختم کر سکو گے۔“

”کیا مطلب...!“

”جتنی رقم چاہو.... مجھ سے طلب کر سکتے ہو۔“

”تم جتنی رقم کہو میں تمہارے ساتھ دفن کر دوں۔“ فریدی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر آدمی بکنے کے لئے نہیں ہوتا کر ٹل سلان۔...!“

”میرا کچھ بھی نہیں بگزے گا۔“ قیدی سینہ تان کر غریل۔ ”تمہیں پچھتا پڑے گا۔“

”اتنی عمر پچھتائے ہی میں گذری ہے۔“ فریدی مکریا۔ ”ایک یہ بھی سکی۔“

”کر ٹل خدا کے لئے کچھ کبھی۔ میرے ڈیڈی۔“ سارہ پھر بول کھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”راستہ؟“ وہ چونکہ پڑی پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”ہے تو میں نے اکثر ڈیڈی سے سنائے لیکن انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”نہیں تم یہیں بھہرو۔ مگر میرا دعویٰ ہے کہ“

صرف اسی حد تک کہ میں نے شتر مرغ کا پچ نکالنے کے امکانات پر پروفیسر سے بحث کی تھی۔
”تو پھر... یہ سلان۔“

”میں بھی اس سے یہی پوچھنا چاہتا تھا۔“ والثن نے کہا۔
”میں کیا جاؤ۔“ سلان غیر لایا۔

”تو پھر پروفیسر ہی نے اپنی اسکیم تبدیل کر دی ہو گی اور اس چمکیلے غبار کوڈاک زنی کا ذریعہ بنانا پڑتا ہو گا۔ ٹھیک ہے اگر یہ سلان کی حرکت ہوتی تو یہ اس وقت یہاں کیوں دکھائی دیتا۔“
”میں تمہیں علم ہے کہ وہ پروفیسر غوری تھیں تھا جسے تم نے انہے پہنچ والا تجربہ کرنے کا شورہ دیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں...!“ والثن کے لمحے میں حیرت تھی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔“
”پھر تم یہاں تھے خانے میں کیسے آپنچا۔“

اپاٹک سلان نے جو ابھی تک چب چاپ کر رہا تھا فریدی پر چھلانگ لگائی۔ فریدی اس کی طرف سے عافل تھا۔ اس نے لڑکہ آگیا۔ والثن کے لئے یہی لمحہ کر گزرنے کے لئے مناسب تھا۔ لہذا وہ بھی جھپٹ پڑا۔ وہ دونوں بیک وقت فریدی پر گرے تھے۔
گو سلان کے ہاتھ بند ہے ہوئے تھے اور میجر والثن اس کا بھی دشمن تھا لیکن شاید اس وقت اس کے ذہن میں فریدی کی مکملہ موت کے علاوہ اور کسی چیز کا تصور نہیں تھا۔ فریدی کی موت اسی اس کی بچت کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ دوسری صورت میں وہ خود بھی ذلیل و خوار ہوتا اور اس کے ملک کے میں الاقوای و قادر کو شدید دھکا لگاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فریدی پر میجر والثن کو ترجیح دی تھی۔

فریدی کے ہاتھ سے روپور بھی نکل گیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش شروع کی لیکن کچھ اتنا بے تکارا تھا کہ وہ دونوں اسے رگڑے ڈال رہے تھے۔

اپاٹک سائز نے لو ہے کی ایک کرسی اٹھا کر سلان کے سر پر دے مار دی۔ وہ بلباکر پلنٹا ہی تھا کہ دوسری بار بھی اس کا سر ہی نشانہ ہوا۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ ہاتھ اب بھی بند ہے تھے۔ چٹ گرا تھا اس لئے بس فرش پر پھر ہی مار تارہ گیا۔ اٹھنے سکا۔
دوسری طرف فریدی اس طرح اٹھا کر میجر والثن بھی اس کے ہاتھوں پر اٹھتا چلا گیا۔ اس

وہ شاکر اسی راستے سے تھہ خانے میں داخل ہوا تھا جس کا علم سائز کو بھی نہیں تھا۔ سائز اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی شکل ہی ایسی ڈراؤنی تھی۔
”مجھے علم ہے کہ تم بہت اچھے نشانہ باز ہو۔“ فریدی مسکرا کیا۔

”اس نے جہالت سے کام لینے کی بجائے عقینہ کھلاو۔ یعنی روپور زمین پر ڈال دو۔ میں ویسے بھی کسی قسم کا جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ اوہ... کرئیں سلان تم بھی موجود ہو۔ خوب۔ ارے کیا تمہارے ہاتھ بند ہے ہوئے ہیں۔ یہ زیادتی کس نے کی ہے۔ شاید آج میرے ستارے بہت اچھے ہیں۔ دوچالاک دشمن ایک ہی جگہ ہاتھ آگے گے۔ فریدی تم نے ابھی تک روپور زمین پر نہیں گریا۔“
”مجھے بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس نے روپور ہاتھ ہی میں اچھا لگاتا ہے... ویسے زمین پر گردابیزے سے اس کے دم تو نکل نہ آئے گی۔“

”اچھا تو سنبھلو...!“ میجر والثن نے فائز جھوک مارا لیکن گولی سامنے والی دیوار سے مکرا کر پھر اس کی طرف پلٹ گئی۔ پھر فریدی نے اسے دوسرے فائز کا موقع نہیں دیا۔ اس کے روپور سے بھی شعلہ نکلا اور میجر والثن نکاریو اور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرد۔ وہ اسے دوبارہ اٹھانے کے لئے جھپٹا ہی تھا کہ فریدی نے لکارا۔

”اپنی جگہ سے جب نہ کر، تو بہتر ہے والثن! ویسے مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ میں خراش نکلنے آئی ہو گی۔ اس اشناک کی گولی ہمیشہ نال ہی پر پڑتی ہے۔“

”میجر والثن دم بخورہ گیا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا اگر اس وقت اس کی پوزیشن ذرا سی بھی تبدیل ہوئی ہوتی تو فریدی کی گولی اس کے روپور پر پڑنے کی بجائے سینے ہی میں اترتی چل جاتی۔“

”پروفیسر غوری کہاں ہے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”اوہ... کیا وہ اپنی کوٹھی میں نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ہاں نظر بند کر دیا گیا ہے۔“
والثن کے لمحے میں حیرت تھی۔

”تم یہاں کیوں آئے تھے۔“

”اُس پچے کا راز معلوم کرنے جس نے ذاکر زنی بھی شروع کر دی ہے۔“
”کیا مطلب! کیا وہ تمہاری حرکت نہیں تھی۔“

بعد انہی مرے میں گم ہو گئی۔ وہ جیری کو اے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کر کے خود پروفیسر کی کوشش سے باہر آیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جھریالی کس طرح بچنے۔ دری بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جیری سے اسے معلوم ہوا تھا کہ میجر والٹن پروفیسر کی تحریب گاہ کی طرف گیا ہو گا۔ تینکی اس نے پہلے ہی چھوڑ دی تھی اور یہاں دوسرا ٹینکی کاملاً محض اتفاقات ہی پر بنی ہو سکتا تھا۔

دفعتہ اسے ایک ٹرینک سار جنت نظر آیا جو موڑ سائیکل پر اور ہر ہی آ رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر اسے روکا۔ سار جنت اسے پہچانتا تھا اس لئے اس سے موڑ باجک حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوئی۔ پھر حید نے اس کی ٹنکی بھروائی تھی اور جھریالی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ یہاں بچنچے پر یہ غیر موقع حداد پیش آیا۔ اسے حادثہ ہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ حید تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ اگر کسی طرح میجر والٹن پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو ہفتوں فریدی سے اکڑ کر گرفتار کر سکے گا۔ پہلے اس نے ضرور سوچا تھا کہ فریدی سارہ کے ساتھ یہیں آیا ہو گا لیکن پھر خود ہی اس خیال کی تردید کر دی تھی۔ بھلا ایک ہی عمارت میں دو عدد ”ڈیلی“ کس طرح مانکتے جب کہ دو عدد ”میلوں“ کا ایک ہی چھت کے نیچے صرف چند ہی گھستے برس کر نادشوار ہو جاتا ہے۔

”لا جول والا قوتہ...! کیا مصیبت ہے۔ سر پیر کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

یک بیک بائیں جانب سے کسی نے ”کرٹل“ کو پکارا اور متواتر آوازیں دیتی ہی چلی گئی۔ وہ سارہ ہی ہو سکتی تھی۔ حید نے آواز پیچان لی اور آواز کی جانب بڑھا۔ شاید فریدی بھی اسی جانب سے سڑک پر آیا تھا۔

”کرٹل صاحب۔“ سارہ نے تھوڑے وقف سے پھر آواز دی۔ شاید اس نے حید کو دیکھ لیا تھا لیکن انہیں ہونے کی بناء پر پیچان نہیں سکی تھی۔ حید کو بھی اس کی دھنڈی پر چھائیں نظر آئی اور وہ دیکھ رک گیا۔

”کون ہے۔“ سارہ نے قریب آ کر خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

”ہاتھی...!“ حید نے جواب دیا۔

”میرے ہاتھ میں پتوں ہے سمجھے؟“

”لا جول والا قوتہ...! میں ڈوئی یاد ستنام سمجھا تھا۔“ حید نے بایوسانہ انداز میں کہا۔

نے اُسے سر سے بلند کیا اور زمین پر دے مارا۔ ”تمیرے...!“ سارہ بچوں کی طرح تالی بجا کر چھپی۔ ”آپ آدمی ہیں یا الف مل کے کوئی دیو! عذر کی پناہ۔“ میجر والٹن اٹھ کر بھاگا۔ فریدی اس کے پیچے پکا۔ لیکن والٹن اسی طرح جی چھوڑ کر دوڑ رہا تھا جیسے ملک الموت سے پیچھا چھترنا چاہتا ہو۔

جس راستے سے وہ باہر نکلا غالباً وہی تھا جس کا تذکرہ سارہ نے کیا تھا۔ لیکن خود اس سے واقع نہیں تھی۔ یہ راستہ عمارت کی پشت پر لے جاتا تھا۔ اختتام چند ٹیکوں کے درمیان ایک عمارت کے دہانے پر ہوا تھا جو کسی جانور کا بحث معلوم ہوتا تھا اور اسے گھنی جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد فریدی اس جیپ کا رکے پیچے دوڑ رہا تھا جس میں بیٹھ کر میجر والٹن نے کسی طرف نکل جانے کی کوشش کی تھی۔ غالباً وہ جیپ اُسی کی تھی۔

فریدی کا اندازہ تھا کہ وہ سڑک تک پہنچنے سے پہلے ہی اس جیپ کو جالے گا۔ شاید وہ اس کی بچھلی سیٹ پر بھی بیٹھ جاتا کیونکہ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے جیپ کی رفتار بھی کم تھی اور اس کا ہڈ بھی گرا ہوا تھا۔

جیپ اب سڑک کے قریب ہی تھی لیکن فریدی ابھی تک چھلانگ لگا کر اس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

دفعتہ سڑک پر اسے کسی موڑ سائیکل کی ہیڈ لائٹ نظر آئی اور وہ اُسی کی طرف دوڑا۔ جیپ جدھر مڑی تھی موڑ سائیکل اُسی کی مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ فریدی دونوں ہاتھ اٹھا کر پیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا اور موڑ سائیکل اُس سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ ”اُرے آپ...!“ سائیکل سوار نے بیساختہ کہا۔

”کون حید...! جیواز نہ مدد باد...! ہٹو! گاڑی چھوڑو...! والٹن نکلا جا رہا ہے۔“ حید بوکھلائے ہوئے انداز میں اڑا کیا۔ اور موڑ سائیکل تیر کی طرح جیپ کے پیچے لپک چل گئی۔

تمید انہیں پھاڑتا رہ گیا اور موڑ سائیکل کی عقبی سرخ روشنی بھی کچھ دیر

”ارے بھجنی چلئے تا۔“ سارہ نے جملائے ہوئے انداز میں اسے شوکا دیا۔

”ہاں.... آں۔ اوہ پستول تھا تمہارے پاس لاو جھے دو۔“

سارہ نے ریو اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ غالباً محروم اللہ کا تھا جسے وہ تہہ خانے ہی میں چھوڑ جھاگا تھا۔ حمید نے اسے جیب میں ڈال کر انہن اشارت کیا اور اسی سمت گاڑی موزدی جدھر فریڈی گیا تھا۔

”تیز چلنے... آپ کو کیا ہو گیا ہے کیپٹن! آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“ سارہ بولی۔

”میں آپ کے ڈیڈیوں کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔ بھلا اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے کتنے ڈیڈی اونچیج کئے ہوں گے۔“

”میرا معتمکہ نہ اڑائیے۔“ وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”کرمل جتنے شریف ہیں آپ اتنے ہی...!“

”اُس سے بھی کہیں زیادہ کمین۔“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”عورتوں کے معاملے میں وہ حضرت کرمل بدھو کہلاتے ہیں پھر عورتیں انہیں شریف کیوں نہ سمجھیں۔“

”اوہ تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا فراڈ کر رہی ہوں۔“

”ہرگز نہیں! فراڈ تو میں کر رہا ہوں۔“

”کیا مطلب...!“

”یہی کہ آپ میرے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ویسے ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ میں آپ کو چلتی گاڑی سے نیچے چینک دہتا۔“

”کاش آپ کو میری مظلومیت کا احساس ہو سکتا۔ وہ دردناک لمحے میں بولی۔ آپ خود سوچ پے اگر آپ کو آخر سال تک کسی گدھے کو ڈیڈی کہنا پڑتا تو آپ کا یا حال ہو جاتا۔“

”لوگ مجھے گدھے کا پچہ سمجھ کر میری عزت کرتے! میری دم پر پھولوں کے ہار لپیٹتے... لوکیاں مجھے روٹک چمن کریں۔ اوہ کہیں آپ لٹک کے اٹھے سے تو نہیں برآمد ہوئی تھیں۔“

”لغت ہے جھپ پر۔“ سارہ بڑا ای۔ ”جن حالات کا میں شکار ہوں وہ میرے لئے دوسروں کی زبانی ہم دردیاں بھی نہیں حاصل کر سکتے۔“

حمدید کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”ذا کمرڈاؤ دے آپ لوگوں کا

”اوہ... گل... کون... حمید صاحب۔“

”نہیں صرف حمید... صاحب تو وہ تھے جو مجھے پیدل بنانے کے لیے چلے گئے! مگر تم بیہاں کیا کر رہی ہو۔“

”وہ کہھ رہے گے ہیں۔“

”حمدید نے دامنِ جاتب ہاتھ اٹھا دیا۔“

”اوہ... بڑا خوفناک آدمی تھا۔ وہ ہو کے سے حملہ کرتا ہے... چلنے... مگر کیسے... کیا وہ اپنی گاڑی پر گئے ہیں۔“

”میں نے کہا تھا کہ مجھے اس وقت پیدل کہتے ہیں۔“

”اوہ... تو آپ کی گاڑی میں گئے ہیں... ان کی گاڑی موجود ہے۔ چلنے والے سمجھے۔“

”آپ کے ڈیڈی۔“

”وہ نہیں ملے۔ خدا کے لئے جلدی سمجھے جلدی۔“ وہ ایک طرف دوڑتی ہوئی بولی۔ حمید کو بہر حال اس کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

فریدی نے اپنی گاڑی لیزارڈی ہی سے کافی فاصلے پر چھوڑی تھی پھر بیہاں سے فاصلہ کیوں نہ بڑھ جاتا۔ دوڑتے دوڑتے حمید پر جلاہٹ سوار ہو گئی اور اس کا دل چاہنے لگا کہ اس تیز رفتار لڑکی کو چھلکی مار کر گرا دے۔

گاڑی سک پچھے کے لئے انہیں تقریباً تین فریلانگ لمبی دوڑ لگانی پڑی تھی۔

”چلنے... چلنے... میرے خدا آپ دیر کیوں کر رہے ہیں۔“ اس نے اسے گاڑی میں دھکلیتے ہوئے کہا اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔

دفعتاً حمید کے ذہن میں ایک شہنے سر ابھارا۔ یہ لاکی شروع ہی سے اس کے لئے معہ نہیں رہی تھی اور حالات بھی کچھ اس قسم کے پیش آئے تھے کہ وہ اب اس پر اعتناد نہیں کر سکتا تھا۔

پروفیسر کو سب اس کا باپ سمجھتے رہے تھے اور وہ خود بھی اگر سمجھتی نہیں تو دوسروں کو بھی سمجھاتی رہی تھی۔ پھر یک بیک دوسرا باپ کیسے پیدا کر بیٹھی یا ایسا کہ بیٹھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ کیا اس لئے نہیں کہ فریدی کوئی غیر متوقع اور سنسنی خیز بات سن کر اس کے ساتھ دوڑا جائے۔ اسی

کیس کے دوران میں ایک بار پہلے بھی انہیں اسی قسم کے ایک واقعہ سے دوچار ہوتا پڑا تھا۔

”وہ گاڑی جنگل کے قریب ہی معلوم ہوتی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”میرا بھی سیکھی خیال ہے۔ کہیں وہ آپ کی ہی گاڑی نہ ہو۔“

”میں موڑ سائکل ہے آیا تھا۔ گرد و سر آدمی... کیا وہ کوئی گاڑی لے بھاگا تھا۔“

”پتہ نہیں! میں بہت دیرے پہنچی تھی۔“

”تو پھر اسی گاڑی کو دیکھنا چاہئے۔“ حمید نے کہا اور گاڑی کچھ راستے پر اتار دی۔ اب اس کا

رخ ذیبور کے جنگل ہی کی طرف تھا۔

ٹھوڑی ہی ذریعہ بعد وہ اس گاڑی تک پہنچ گئے۔ یہ ایک ایسی جیپ کار تھی جس کا بند ندارد تھا۔

شائد کوئی اسے اتنی جلدی میں چھوڑ کر گیا تھا کہ نہ تو اس نے ہیڈ لیپس بجھانے کی زحمت گوارا کی تھی اور نہ اس کی پروادہ کی تھی کہ ان جن طبقے رہنے سے خواہ خواہ اپنے ہن ضائع ہو گا۔ حمید نے گاڑی سے نارچ نکالی اور قرب وجوار کا جائزہ لینے لگا۔

”اوہ...!“ وہ ٹھکر گیا۔ ٹارچ کی روشنی کا، اگرچہ متن پر پڑی ہو، ایک مہڑ اسکل یہ رک گیا تھا۔

”کیا بات ہے۔ کیا یہ آپ کی بائیک ہے۔“ سارہ نے پوچھا۔ حمید نے اثبات میں سر کو جنت دی۔

”خدا کی پتھر یہی منہوس پہاڑیاں۔“ سارہ نے ٹھنڈی سانس لی اور حمید نے اسے گھور کر دیکھا۔

انہیں پہاڑیوں میں اسے آج ہی کئی دل ہلاوی نے والے تجربات ہوئے تھے جن کی ذمہ داری کسی حد تک شائد اس لڑکی پر بھی تھی۔

”تم واپس جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”وہ یقینی طور پر جنگل ہی میں داخل ہوئے ہیں۔“

”یہ ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے ڈیڈی بھی سیہیں ہوں۔“

”یہ کس بناء پر کہہ رہی ہو۔“ حمید نے پھر کان کھڑے کئے!

”محض قیاس ہے۔“

حمدید نے جیپ کا انجن بھی بند کر دیا اور ہیڈ لیپس بھی بجھا دیے۔ اب وہ نارچ کی روشنی میں

قدموں کے نشانات تلاش کرنے لگا۔ یقینی طور پر کچھ آدمی اس جگہ سے چل کر جنگل میں داخل

ہوئے تھے۔

”کیوں نہ ہم سیہیں رک کر کر قل کی واپسی کے منتظر ہیں۔“ سارہ نے کہا۔

کیا تعلق تھا۔“

”اوہ... وہی تو اس بر بادی کا باعث ہتا ہے۔ آپ نے ہسپتاں میں مشکل اور دائرہ کے متعلق ایک مھککہ خیز بات کہی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے... مگر...“

”اوہ... میرے خدا۔“ وہ یک بیک اچھل پڑی۔

”کیوں...؟“

”بھی کرتی جس کے پیچھے گئے ہیں... وہ... وہ بالکل الو معلوم ہو رہا تھا۔“

”اک تو میں بھی معلوم ہو رہا ہوں گا۔“

”یقین کیجئے بالکل الو معلوم ہو رہا تھا۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ الو کیوں معلوم ہو رہا تھا۔ مجتب ساچہ رہا تھا۔“

”خرچوڑی ہے... ہاں تو آپ ڈاکٹر داؤڈ کے بارے میں کیا بتانا چاہتی تھیں۔“

”میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ قاتل کے متعلق استفسار پر اس کی زبان سے لفظ الو کیا تھا جسے وہ مرتبے وقت تک رثا رہا تھا۔“

”لہذا ایکی الو تو اس کا قاتل ہو سکتا ہے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن میں نے اس کے قاتل کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔“

”میں کرتی کو سب کچھ بتاچکی ہوں۔ ذرا فرقہ اور تیز کیجئے۔“

”میں بھی آپ ہی کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔“

”مجھ میں اب سکت نہیں ہے۔“ وہ مردہ سی آواز میں بولی۔

”یہ سفر جہنم کے دہانے پر تونہ ختم ہو گا۔“ حمید نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”آپ کا ذہن ابھی تک میرے متعلق الجھاٹی ہوا ہے۔“ سارہ نے کہا اور پھر چمک کر بولی۔ ”اوہ... وہ روشنی ہی تو ہے۔ اور ہر دیکھنے والیں جائب۔“

یقیناً روشنی ہی تھی لیکن فاصلے کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کار تیزی سے راستہ طے کرتی رہی۔ ایک موڑ پر دیکھی روشنی کی گاڑی کے ہیڈ لیپس کی روشنی ثابت ہوئی۔ لیکن وہ دوسری گاڑی تھرک نہیں معلوم ہوتی تھی۔

ڈیڈی ذیبور کی پہاڑیوں کی دیو آس اپر چھائیاں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔

بی کہ عمل شکانے آگئی۔ اچھی طرح اجلا پھیل جانے کے بعد وہ پھر ایک جانب چل پڑے۔ سارہ بہت شدت سے پر نظر آری تھی۔ اُس نے ایک بار جلاہٹ میں حمید سے بہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اُسے ایک اپر دلا اور عکما آدمی سمجھتی ہے جس کے جواب میں حمید نے کہا تھا۔ ”کچے کریلے مت چباو۔ میں تم سے کب خواہش ظاہر کی تھی کہ میرے ساتھ جھک مارتی پھرو۔“ اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا سارہ کے پاس۔ خاموش رہ جانے کے علاوہ اور کیا کرتی۔ اس وقت وہ ایک چنان سے اتر کر نشیب میں جا رہے تھے کہ اچانک انہیں کسی کے پیور نظر آئے جو ایک پھر پر لکنے ہوئے تھے اور جسم کا بقیہ حصہ پھر کے نیچے تھا۔ اس لئے قریب پہنچ پہنچر چہرہ نظر آتا مشکل ہی تھا۔ سارہ نے تو اُس تک پہنچنے میں اتنی عجلت لکر ایک بار گردی پڑی تھی۔

”مرے..... یہ تو.... وہی ہے۔“ اُس نے چیخ کر کہا۔

حمدی نے پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان لیا۔ یہ میحر واللہ ہی تھا۔ جس کی تصویر اُس نے فریدی کی کوئی نہ نظر نہیں دیکھی تھی۔ لیکن وہ مرچ کا تھا۔ جسم پر کہیں بھی کوئی ایسا زخم نظر نہ آیا جسے گولی لگنے کا نتیجہ سمجھا جا سکتا۔ البتہ سر کا پچھلا حصہ پاش پاش ہو چکا تھا۔ ”اوہ.... اوہ....“ سارہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”کرمل نے اسے بالکل اُسی طرح اٹھا کر چھا ہو گا جیسے تھے خانے میں ٹھا تھا۔ خدا کی نیا۔ ایسے کیم شیم آدمی کو سر سے اوچا اٹھا کر تخت دینا مجھے تو کی جن ہی کا کام معلوم ہوتا ہے۔“

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ جن تمہارے سر پر نہ آجائے۔ لیکن اسے یاد رکھنا کہ یہ جن سو فحصی ہورت پروف ہے۔ خوبصورت سے خوبصورت لوز کیاں اس کے لئے شاخم کی ترکاری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے وہ اپنے دستر خوان پر برداشت تو کر لیتا ہے لیکن اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت گواراہ نہیں کرتا۔“

”بکواس کیوں شروع کر دی آپ نے۔“ سارہ نے آنکھیں نکالیں۔ ”میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کے خیالات اتنے گندے کیوں ہیں۔“ ”محض اس لئے کہ میں تو اکثر کچے شاخم بھی نگل جاتا ہوں۔“ حمید نے کہا اور پھر میحر واللہ

”انتظار تو تمہاری تجربہ گاہ میں بھی ہو سکتا تھا۔“ حمید نے خشک لبجھ میں کہا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔

بہر حال وہ جنگل میں گھس پڑا لیکن کوشش ہی تھی کہ سارہ سے ایک قدم بھی پچھے نہ رہنے پائے! کیونکہ اُس کی طرف سے مطمین ہو جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

لقریباً ایک گھنٹے تک ادھر ادھر جنگلنے کے بعد حمید کو اپنی حمact کا احساس ہوا کیونکہ وہ راستے کا تعین کئے بغیر جنگل میں داخل ہوا تھا۔

”میرے خدا....!“ سارہ خوفزدہ لبجھ میں بولی۔ ”یہ کسی بھی ایک آوازیں ہیں۔“

” مختلف قسم کے جانوروں کی ملی آوازیں ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ مگر کیا تم ڈر رہی ہو۔“ ”ن..... نہیں تو۔“

بس حمید سے اتنی ہی غلطی ”سرزاد“ ہوئی تھی کہ وہ لٹکن کی اگلی سیک کے نیچے سے ایک نایا گنگی اور اُس کا کچھ میگریں نکال لایا تھا۔

وہ بھکتے رہے لیکن جنگل سے نکلا ممکن نہ ہوں حمید خصوصیت سے ان حصول کی طرف رخ بھی نہیں کر سکا جہاں اسے کائی نظر آتی تھی۔ آج ہی اس کائی کی پھیلنے کے سبق میں دیے تھے۔

سارہ کی وہ بھی سے اکثر اسے دم لینے کے لئے رکنا بھی پڑتا۔ غیمت بھی تھا کہ ابھی تک کسی جنگلی درندے سے ٹرکھی نہیں ہوئی تھی ورنہ سارہ کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا۔

وہ بھکتے رہے اور افق میں اجلا پھیلنے لگا۔ حمید کے ذہن پر نیند کے ساتھ ہی جلاہٹ بھی مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے سارہ سے کہا۔ ”تمہارا نام سارہ ہی ہے نا۔“

”کیوں! کیا آپ ابھی تک خوب دیکھ رہے تھے۔“ سارہ نے پڑھاہٹ ظاہر کی۔

”نہیں میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا ستارہ زحل ہے۔ زحل جو خوست کا ستارہ کہلاتا ہے۔“

آہستہ آہستہ اجلا پھیلتا رہا۔ حمید ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا خالی معدے اور تاپتی ہوئی کھوپڑی کے درمیان سمجھوتہ کر رہا تھا۔ اسی دوران میں سریز شامت نے گھیرا تو پاپ بھی سلاگا بیٹھا۔ لیکن تین ہی چار کشوں نے تارے کھا دیئے۔ کھانتے کھانتے پچھوڑے دھوکنی بن گئے۔ شب بیداری، تھکن اور بھوک نے تمباکو کے دھوکیں میں لپیٹ کر اسے ایسی ایسی پٹھنیاں

کی لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی نے اسے مار کیوں ڈالا۔ اسے تو زندہ ہی گرفتار کرنا چاہئے تھا۔ مگر پھر سوچا ہوا سکتا ہے کہ والٹن خود ہی جان دینے پر عمل گیا ہو۔ فریدی خواہ گواہ خون بہانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن کیا اب وہ یہاں سے جا چکا ہے؟ حمید کی دلانت میں یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ کسی ایسے مجرم کی لاش یہیں چھوڑ جانا پسند نہ کرتا جس کی حیثیت میں الاقوامی رہی ہو۔ وہ اسے اخا کر اسی جیپ کا رہیں شہر لے جاتا جو انہوں نے جنگل کے باہر دیکھی تھی۔ لہذا یہاں اس لاش کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ بھی ابھی جنگل سے باہر نہیں نکلا۔

حید سوچ ہی رہا تھا اسے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک چنان کی پشت سے کسی ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز آئی اور حید یوکھلا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیونکہ یہ آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ آواز اسی فٹمن کی ہو سکتی تھی جو شتر مرغ کے اندر سے پر آمد ہوا تھا۔ حید کا اندازہ غلط نہیں تکادوسرے ہی لمحے میں اس نے چنان سے پیچے چلا گئی اگلی اور حید پر دو لمحے جماڑتا ہوا دوسرا طرف نکل گیا۔ پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ حید نے اس کی پرواد نہیں کی کہ بعد میں آئے والا گون تھا۔ بس وہ تو اس کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔ وہ پھر ایک اوپھی کی چنان پر جا چکا۔

اس کے گرد سر سے پیر تک چکدار غبار سا گردش کر رہا تھا۔ حید نے تای گن سید ہی کی اور اس پر گولیاں برسنے لگیں۔ لیکن وہ تو نہایت اطمینان سے کھڑا تای گن ہی کی آوازیں اپنے حلق سے نکال رہا تھا۔ گویا پھر رہا تھا تای گن کو۔

حید نے جلا کر یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا اور اس ناچمار شتر مرغ زادے نے قفاری مار کر حید کو چوچنگ دکھائی۔

”رہنے دو...!“ وہ فریدی کی آواز سن کر مڑا۔ فریدی ہاتھ اخما کر بولا۔ ”میں کتنی گھنٹوں سے زخم ہو رہا ہوں۔ تای گن اس کا بچھے نہیں بگاڑ سکے گی۔“

پچھے نے پھر ریلوے انجن کی سیٹی بجائی اور جھک جھک کر فریدی کو سلام کرنے لگا۔ فریدی پڑا۔ پھر بولا۔ ”یہ کم بخت سال ہا بسال سے میرے ذہن پر بار بنا ہوا ہے۔“

”سالہا سال سے کیا مطلب۔“ حید نے تحریر انداز میں پوچھا۔

”کیا تم اسے نہیں پہچان سکتے۔“

”ن..... نہیں....!“ حید نے کچھ سوچتے ہوئے سر کو جبکش دی۔

”یہ فتح ہے...!“
”نہیں....!“ حمید اچھل پڑ
”یہ فتح ہے اور اس کا تعلق کسی بھی پارٹی سے نہیں رہا۔ جس کے لئے یہ سب اتنے دنوں سے سردار ہے تھے وہ اس نے معمولی سی ذہانت صرف کر کے حاصل کر لی۔ اب تم دیکھ رہے ہو کوئی اس کا کیا بھاڑے گا۔ بس اگر یہ ہاتھ آجائے تو پکڑا ضرور جا سکتا ہے۔ لیکن گولی بھی نہیں لگ سکتی وہ غبار سے کٹا کر نکل جائے گی۔“

”ٹوڑے کر ٹوں دی گریٹ رک کیوں گئے؟ پکڑو مجھے۔“ فتح نے اوپر سے لکارا۔ ”میں تمہیں اسی طرح دوڑا تار ہوں گا اور جب تھک کر گر جاؤ گے تو میں سب سے پہلے تمہاری ناک کاٹوں گا۔ پھر کان صاف کروں گا۔ لیکن گردن نہیں کاٹوں گا تاکہ تم لوگوں کو اپنا پاٹ چپڑہ دکھانے کے لئے کچھ دن تو زندہ رہو۔“

”پھر اُو کروں۔“ حمید جلا کر بولا۔

”وہ بھی فضول ثابت ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”وقت سے چھٹیں ہوئی کوئی بھی شفیل چیز غبار سے نہیں لگ رکے گی۔ البتہ تم اس غبار میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن ضرور دبا سکو گے۔“

”یہ سب کیسے معلوم ہوا آپ کو۔“ سائزہ نے پوچھا۔

”آپ کے ڈیٹی کی عنایت ہے۔“

”اوہ.... ڈیٹی.... وہ کہاں ہیں۔“

”اس وقت شہر کے راستے میں ہوں گے۔ میں نے انہیں والٹن کی جیپ میں بیٹھا دیا تھا۔ وہ فتح ہی کے قیدی تھے۔ میں ایک غار میں غالب فتح اٹھیں یہاں اس لئے لایا تھا کہ ان سے اس غبار کے متعلق کھل معلومات حاصل کر سکے۔“

”کیا تم نے ہمت ہار دی ہے کر ٹوں فریدی۔“ فتح نے اسے پھر لکارا۔

”نہیں بیٹے۔“ فریدی نے نہیں کر کہا۔ ”میں نے قسم کھائی ہے کہ آج تمہاری آزادی کا آخری دن ہو گا۔“

”آؤ تو پھر وقت کیوں بر باد کر رہے ہو۔“

پہنچ دیر بعد آوازیں آئیں بند ہو گئیں۔ فتح بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔



میجر والٹن آخری جدو جہد کے دوران میں فریدی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور فتح یہوشی کے ہام میں جنگ سے اٹھا گیا تھا۔ کرنل سلانن پروفیسر غوری کی تحریر ہے گاہ میں گرفتار ہوا۔ جو نکہ میجر والٹن کا ایک خاص آدمی جیری پہلے ہی ہاتھ آچکا تھا اس لئے پورا اگر وہ بے آسمانی کھود نکالا گیا۔ والٹن سالہ سال سے بیہان بر اجمان تھا اور اُس کے اجنب ایک اغیر ملک کے لئے جاسوسی کیا کرتے تھے۔ اُن بھائیوں والی گاڑی جس سے نکلا کر ایک کار فنا ہو گئی تھی، والٹن ہی کی تلکیت تھی۔ وہ بھی شہر کی ایک درکشہ سے برآمد کر لی گئی۔ وہ بظاہر ایک معمولی سی بڑی گاڑی تھی لیکن جب اس کے لگے حصے سے ایک بڑا سایفر اچھ کر دیا جاتا تھا تو وہ بے حد خطرناک ہو جاتی تھی اور بھی بفر گرانے والی چیزوں کے پر فتحے اڑا دیتا تھا۔

حید کو ابھی تک تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ حالانکہ اس قسم کو ختم ہوئے تین دن گذر چکے تھے۔ فریدی اس دوران میں زیادہ تر مظہری ہیئت کو اور اُڑیں رہا تھا۔

چوتھے دن کہیں حید کی باری آئی۔ پروفیسر مقدس غوری والا معاملہ تو اسے ابھی تک بے و سر و پاہی معلوم ہو تراہا تھا۔ لیکن فریدی نے اُسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”قدس غوری بھپن ہی میں بفرض حصول تعلیم جرمنی بھیج دیا گیا تھا۔ بھپن سے چالیس سال کی عمر تک وہ وہیں رہا اور اس نے وہاں بعض اعلیٰ درجہ کے سائینسیک تحقیقی کارنائے انجام دیے۔ جنگ کے بعد بھی وہ مغربی جرمنی میں مقیم رہا۔ ڈاکٹر داؤد بھی ان دونوں جرمنی ہی میں تھا۔ لیکن جنگ کے دوران میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ ایک رات وہ اچاک پروفیسر غوری کے مکان پر پہنچا اور اُسے بتایا کہ وہ خطرے میں ہے اُس نے اُس کے پاس ایک موٹا پیکٹ المانٹا رکھو لیا اور پھر غائب ہو گیا۔ تقریباً دو سال بعد فتح کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے اسی پر پتھر سچھ مارا تھا۔ کھلیاں جلا کر اڑیں اور اُس کے چھٹ اس پیکٹ کی کہانی سنائی! اُس میں ایک بڑے سائنسدان کے ایک جیزٹ انگریز تحریر کے کاغذات تھے جو جنگ کے دوران میں اُس نے مرتبے وقت ڈاکٹر داؤد کے پردازے تھے! اور اس سے استدعا کی تھی کہ خواہ وہ اٹھیں تکف کر دے لیکن مختلف قوتوں کے ہاتھ انہیں نہ لگنے دے۔ پروفیسر

”ایک نہیں دس پتھر مارو۔“ فتح نے اوپر سے جواب دیا۔ چکیلا غبار بھی اُس کے گردناہ رہا تھا۔

فریدی نے جنگ کر پتھر اٹھاتے ہوئے آہتہ سے کہا۔ ”تم لوگ جتنا تیر دوڑ سکتے ہو دوڑوا سامنے والی چنان پر بکر کر میرا منتظر کرنا۔“

جیسے ہی انہوں نے مڑ کر دوزنا شروع کیا فتح قہقهہ لگا کر بولا۔ ”کوئی چال کارگر نہیں ہو سکتی کرنل فریدی تم مجھے یہ قوف نہیں بنائے گے۔“

”پتھر سنجاوو...!“ فریدی سید حاکم را ہو تاہو بولا۔

”آنے دو۔“ فتح نے کی بوڑھے بندر کی طرح گردن اکڑائی۔

فریدی نے درخت پر پتھر چالیا اور خود بھی مڑ کر بے تھاش اُس طرف بھاگا جو ہر حید اور سارہ گئے تھے۔ یک بیک انہوں نے فتح کی چیزوں سیل۔ حید نے مڑنا چاہا لیکن فریدی بولا۔ ”خبر دار دوڑتے رہو۔“

بالآخر وہ اُسی چنان پر پتھر کر کے۔ فتح درخت سے گر کر زمین پر لوٹ رہا تھا اور بُری طرح پیچنے جا رہا تھا۔ ”بچاؤ... بچاؤ... بچاؤ...“

کبھی اٹھ کر پاگلوں کی طرح ناچنے اور اچلنے کو نہ لگتا اور کبھی گر کر زمین پر ایڑیاں رگڑتا۔ ”بہت اچھے۔“ فریدی منہ پر ہاتھ لگا کر چھا۔ ”یہ تھا آخری پتھر ہی۔ اب پر ہکڑ سے کوچکائے تمہاری جان۔“

”کیا کیا تھا آپ نے۔“ حید نے جیزٹ سے پوچھا۔

”ہاتھ پر کتے کا پلا کھینچ مارا ہے۔“ فریدی مکرایا۔ ”میں نہیں کھینچا۔“

”بچاؤ... بچاؤ... کرنل... کرنل...“ فتح میں پرلوٹا اور چھتارہا۔

”شہد کی کھیاں۔“ فریدی بولا۔ ”ایک بڑا ساچھتا اور پی شاخوں کے درمیان لٹکا ہوا تھا جس پر فتح کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے اسی پر پتھر سچھ مارا تھا۔ کھلیاں جلا کر اڑیں اور اُس کے چھٹ کیں۔ میں نے اسی لئے تم کو جھاگئے کو کہا تھا۔“

”خدا کی پناہ۔“ سارہ منہ کھول کر رہ گئی۔

بھی اطلاع دیتا۔ بہر حال اسے گولی مار دی۔ ڈاکٹر نے اس دھمکی کا تذکرہ نصیری سے بھی کیا ہو گا۔ لڑاکا طیاروں کو دشمن کے جملوں سے سو فیصد محفوظ رکھے گی۔ ڈاکٹر نے اس کو اس پر آمادہ کیا کہ ”دھن میں پہنچ کر اس تجربے کو مکمل کرے، جو مرనے والے سائنسدان کے بیان کے مطابق کی مرٹک اور حورا رہ گیا تھا۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ کچھ نامعلوم لوگ ان کاغذات کے چکر میں ہیں جو ہو سکتا ہے کہ دھن نکل اس کا تعاقب کریں اس لئے بڑی رازداری سے کام لیتا پڑے گا۔ لہذا انہوں نے اسکم بنا کی کہ ایک نقی پروفیسر غوری پیدا کیا جائے اور خود پروفیسر غوری سکون کے ساتھ کی گوشے میں وہ تجربہ مکمل کرے۔ سارہ بڑی ذین اور حجت لڑکی تھی اس لئے اسے بھی رازدار بنایا گی۔ کونکہ اس کے بغیر تو کام چل سکتا۔ دھن پہنچ کر ایک تجربہ گاہ بنا لی گئی جس کے پیچے بھی تجربہ گاہ تھی۔ پروفیسر غوری تجہ خانے ہی دالی تجربہ گاہ میں رہتا تھا۔ چونکہ کسی نے اسے پہلے بھی دیکھا نہیں تھا اس لئے نقی پروفیسر غوری جو اس سے کسی حد تک مشابہ بھی تھا بخوبی جل گیا۔ پہلے پروفیسر غوری نے اس اسکم کی خلافت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ملٹری کے سائنسی تحقیقاتی ادارے کے تحت کام کرے گا لیکن ڈاکٹر داؤن نے اسے سمجھایا کہ مغربی ممالک کے جاوس بڑے خطرناک ہوتے ہیں وہ وہیں سے اس کا راز اپنے اس گے۔ لہذا کوئی نہ پہلے تجربہ خاموشی سے مکمل کیا جائے پھر اس کے بعد اسے ملٹری کے تحقیقاتی ادارے کے پروردگاریا جائے۔ اس طرح سکون کے ساتھ کام بھی ہو جائے گا اور غیر ملکی جاوسوں سے بھی بجان پیچے رہے گی۔ حالانکہ ڈاکٹر کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ وہ تو بس پروفیسر سے تجربہ مکمل کرنے کے بعد خود زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرنا پاہتا تھا۔ تجربہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میر دالن اس سے آنکھ ریا۔ شائد اسے علم تھا کہ کاغذات ڈاکٹر کے پاس ہیں۔ وہ اسے غالباً نہیں میں اتارتا ہا گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر نے اس سے کہا ہو کہ تجربہ مکمل ہو جانے کے بعد وہ فارمولہ اس کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور ”الو“ کا حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر سے اپنی اصلی ہی بھل و صورت میں ملا ہو گا۔ بہر حال دوسری طرف ڈاکٹر نے نصیری کو رازدار بنایا کہ اس غیر ملکی سفارت خانے سے بھی گفت و شنید کرائی تھی۔ سفارت خانے کی آفری کی ہوئی رقم شائد دالن کی رقم سے زیادہ تھی۔ دالن کو شائد اس کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے پہلے تو ڈاکٹر کو دھمکایا ہی ہو گا اور پھر جلا کر ختم کر دیا ہو گا۔ اگر پہلے دھمکی تھی تو ڈاکٹر کو تو قابو کو

”آپ نے پہچان لیا تھا....؟“ حمید نے پوچھا۔
”قطیعی طور پر! اسی لئے مجھے فکر ہوئی تھی کہ پروفیسر غوری کے ذرائع آمدی معلوم کروں۔“

غوری نے اُن کاغذات کا مطالعہ کر کے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ ایک ایسکی ایجاد پر لڑاکا طیاروں کو دشمن کے جملوں سے سو فیصد محفوظ رکھے گی۔ ڈاکٹر نے اس پر آمادہ کیا کہ ”دھن میں پہنچ کر اس تجربے کو مکمل کرے، جو مرنے والے سائنسدان کے بیان کے مطابق کی مرٹک اور حورا رہ گیا تھا۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ کچھ نامعلوم لوگ ان کاغذات کے چکر میں ہیں جو ہو سکتا ہے کہ دھن نکل اس کا تعاقب کریں اس لئے بڑی رازداری سے کام لیتا پڑے گا۔ لہذا انہوں نے اسکم بنا کی کہ ایک نقی پروفیسر غوری پیدا کیا جائے اور خود پروفیسر غوری سکون کے ساتھ کی گوشے میں وہ تجربہ مکمل کرے۔ سارہ بڑی ذین اور حجت لڑکی تھی اس لئے اسے بھی رازدار بنایا گی۔ کونکہ اس کے بغیر تو کام چل سکتا۔ دھن پہنچ کر ایک تجربہ گاہ بنا لی گئی جس کے پیچے بھی تجربہ گاہ تھی۔ پروفیسر غوری تجہ خانے ہی دالی تجربہ گاہ میں رہتا تھا۔ چونکہ کسی نے اسے پہلے بھی دیکھا نہیں تھا اس لئے نقی پروفیسر غوری جو اس سے کسی حد تک مشابہ بھی تھا بخوبی جل گیا۔ پہلے پروفیسر غوری نے اس اسکم کی خلافت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ملٹری کے سائنسی تحقیقاتی ادارے کے تحت کام کرے گا لیکن ڈاکٹر داؤن نے اسے سمجھایا کہ مغربی ممالک کے جاوس بڑے خطرناک ہوتے ہیں وہ وہیں سے اس کا راز اپنے اس گے۔ لہذا کوئی نہ پہلے تجربہ خاموشی سے مکمل کیا جائے پھر اس کے بعد اسے ملٹری کے تحقیقاتی ادارے کے پروردگاریا جائے۔ اس طرح سکون کے ساتھ کام بھی ہو جائے گا اور غیر ملکی جاوسوں سے بھی بجان پیچے رہے گی۔ حالانکہ ڈاکٹر کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ وہ تو بس پروفیسر سے تجربہ مکمل کرنے کے بعد خود زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرنا پاہتا تھا۔ تجربہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میر دالن اس سے آنکھ ریا۔ شائد اسے علم تھا کہ کاغذات ڈاکٹر کے پاس ہیں۔ وہ اسے غالباً نہیں میں اتارتا ہا گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر نے اس سے کہا ہو کہ تجربہ مکمل ہو جانے کے بعد وہ فارمولہ اس کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور ”الو“ کا حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر سے اپنی اصلی ہی بھل و صورت میں ملا ہو گا۔ بہر حال دوسری طرف ڈاکٹر نے نصیری کو رازدار بنایا کہ اس غیر ملکی سفارت خانے سے بھی گفت و شنید کرائی تھی۔ سفارت خانے کی آفری کی ہوئی رقم شائد دالن کی رقم سے زیادہ تھی۔ دالن کو شائد اس کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے پہلے تو ڈاکٹر کو دھمکایا ہی ہو گا اور پھر جلا کر ختم کر دیا ہو گا۔ اگر پہلے دھمکی تھی تو ڈاکٹر کو تو قابو کو

کوئی استعمال کردہ چیز مانگی۔ یہ کام اُس کے لئے بہت دشوار تھا۔ لیکن کسی کی طرح اس نے ان کے لیڈر کی ایک بچھی ہوئی جراب حاصل ہی کر لی۔ بعد میں پتہ چلا کہ واللہ کے کچھ آدمی بھی ڈیہور کی پہلا یوں میں رہتے تھے اور اُس دن وہ جنگ انہیں دونوں پارٹیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ سلانن کے آدمیوں نے سارہ کو پکڑا تھا اور واللہ کے آدمی اُسے اُن سے چھین لے جانا چاہتے تھے۔ ”مگر آپ نے وہ بھگڑا کیسے فرو کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں طرف کے آدمی بھاگ نکلے تھے۔“

”وہ اسمیثر کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ کسی نے ”پولیس ڈاگ“ کا نزد بگایا تھا اور پھر وہ بھی فرار ہو گئے تھے۔ حالانکہ اسمیثر نے اُن کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ وہ تو جس کی تلاش میں تھا اسی راہ پر لگا رہا تھا۔“ حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”نصری کے اس نوٹ کا کیا مطلب تھا چوہا۔۔۔ محفوظ ہے۔“

”اوو۔۔۔ وہ نوٹ۔۔۔ وہ اُسی تجربے کے متعلق تھا۔ پروفیسر نے ایک چوبے پر میگنت بلٹ چڑھا کر اُس پر فائر کئے تھے لیکن وہ محفوظ رہا تھا۔ ڈاکٹر داؤڈ نصری کے ذریعہ روزانہ کی خبریں کر کل سلانن تک پہنچاتا رہتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے نصری کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ تجربہ کہاں مکمل کیا جادہ ہے اور اُس کی تکمیل کرنے والا کون ہے۔ درستہ ان دونوں کے قتل کے بعد ہی سلانن کے آدمی تجربہ گاہ پر چڑھ دوڑے ہوتے۔ یہ ایجاد حقیقتاً حیرت انگیز ہے۔ چکیلے ذرات ایک مقناطیسی نظام کے گرد مخصوص فاصلے سے چکراتے رہتے ہیں۔ یہ فاصلہ گھنیا بڑھایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر جو ذرات فتح کے گرد چکراتے رہتے ہیں یہی ایک طیارے کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔ بس اُس مقناطیسی نظام میں تھوڑی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اتنے ہی ذرات بڑے سے بڑے طیارے کی لمبائی اور چوڑائی کو ڈھک لیں گے۔ تم نے صرف گولیوں کا تجربہ کیا ہے۔ پروفیسر کا دعویٰ ہے کہ کسی ایسے طیارے پر مراکل کا حملہ بھی ناکام ہو جائے گا جس کے گرد یہ ذرات موجود ہوں اور یہ دونوں بدجنت ایسی چیز غیروں کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔“

”پروفیسر کو سکتہ ہو گیا تھا جب اُسے یہ معلوم ہوا۔ ڈاکٹر داؤڈ اُسے کسی غیر ملکی سفارت خانے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر داؤڈ اُس کے نام ملٹری کے اعلیٰ حکام کے جعلی

”ٹھیک یاد آیا۔ آپ کو یہ خیال کیسے پیدا ہوا تھا کہ وہ حقیقتاً پروفیسر غوری نہیں ہے۔ آپ نے دستخطوں کا مسئلہ کس بناء پر اٹھایا تھا۔“

”اکمِ تکمیں آس میں اُس کے ذرائع آمدنی کے متعلق کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ایک تاجر نے بریلیں تذکرہ اُس کے جھکی پن سے متعلق ایک واقعہ سنایا۔ کسی دن سفرنر ہینک میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ تاجر کا کچھ روپیہ پروفیسر کے ذمے تھا۔ اُسے روپیوں کی شدید ضرورت تھی۔ پروفیسر کے پاس اُس وقت اکاؤنٹس کے متعلق ضروری کاغذات بھی تھے اور چیک بک بھی موجود تھی۔ تاجر نے اُس سے کہا کہ اگر وہ اُسے چیک ہی دے سکے تو اُس کی بعض و قسم پر بیانیں رفع ہو جائیں گی۔ اس پر پروفیسر بہت بگرا تھا اور بکھرا تھا کہ وہ راہ چلتے چیک لکھنے کا عادی نہیں ہے۔ دوسرے دن کیش بھجوادے گا۔ اُس نے اُسی دن اُس کی مطلوب رقم بھجوادی تھی۔ لیکن چیک نہیں دیا تھا۔ میں نے مزید پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ اُسے اکثر چیک ہی ملتے رہے ہیں مگر جب بھی ملے ہیں سارہ ہی کے ہاتھوں ملے ہیں۔ بہر حال اس چیز نے مجھے اُس کے دستخطوں کا مسئلہ چھیڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ہاں تو ہر حال جب تک فتح یونہی اور حرم چاتارہا ان دونوں پارٹیوں میں سے کسی نے بھی اُس کی طرف زیادہ دھیان نہ دی۔ لیکن یہی وہ چکلے غبار سمیت ظاہر ہوا۔ وہ سب پروفیسر کی تجربہ گاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن فتح تو پروفیسر مقدس غوری کو پہلے ہی بکال لے گیا تھا۔“

”ڈراٹھر ہیے۔“ حمید نے کہا۔ ”ڈیہور کی پہلا یوں میں سارہ اُس سے پہلے ہی لے جائی گئی تھی۔ یعنی اُس وقت چکلے غبار کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ لیکن لے جانے والے نے اس سے بچے کی اصلاح معلوم کرنی چاہی تھی۔“

”چکلے غبار کا ظہور ہو چکا تھا۔ مجھے دیر سے اطلاع ملی تھی۔“

”پتہ نہیں ابھی اور کتنے پوائنٹس ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آسکے۔ مثال کے طور پر وہ چھٹی ہوئی جراب جس کے ذریعہ ملٹری اسی تک پہنچا تھا۔“

”میں تمہیں پہلے ہی بتاچکا ہوں کہ سفارت خانے کی ایک عورت میرے نئے بھی کام کرتی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ کر کل سلانن کے بچھے بے ضابطہ ملازم ڈیہور کی پہلا یوں میں مقیم ہیں۔ لیکن وہ اُن کی صحیح نشاندہی نہیں کر سکی تھی۔ میں نے اُس سے ان لوگوں میں سے کسی کی

عیا تھا۔ ورنہ شاپر فچ اپنا کام کر گیا ہوتا۔ اب دہاں میرے لئے دو تھے ایک والٹن اور دوسرا فچ۔ دنوں ہی اندر ہیرے میں گم ہو چکے تھے۔ والٹن مر گیا تھا مجھے اس کا افسوس ہے۔ مگر کیا کروں اُس نے چپ کر عقب سے حملہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے بجاہ کے لئے اضطراری ہی طور پر پوری قوت صرف ہو جاتی ہے۔ وہ اچھل کر میری پشت پر آیا تھا اور میں نے پوری قوت ہے اُسے دوسری طرف الٹ دیا تھا۔ اُس کا سر کسی چنان سے نکلا کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پھر اجالا چھیتے ہی فچ سے دوبارہ مدد بھیڑ ہو گئی۔ پہلے تو اُس نے اپناریو اور مجھ پر خالی کیا پھر پتھر اور پر اتر آیا۔ فریدی خاموش ہو کر سکار کے کش لینے لگا۔ حمید نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب دائرہ اور مثلت کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”ممکن ہے تمہارا ہی خیال درست ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ” دائرة اور مثلت سارہ اور مقدس کی تصوراتی تکمیل ہی ہوں۔ ان کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہر آدمی کے ذہنی تجربات مختلف ہوتے ہیں۔ لفظ سارہ سن کر تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔“ ”کم بختی۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔ ”بس یہی محسوس ہوتا ہے جیسے بارہ گھنٹے کے نوش پر شادی ہو جائی۔ مقدس۔ ایسا لگتا ہے جیسے دنوں کے درمیان ایک بڑا سالم شامی جو تاحال کی جو۔“



سارہ بڑی طرح حمید کے ذہن سے چک کر رہ گئی تھی۔ اُسے علم تھا کہ وہ اکثر آر لکھوں میں بیٹھتی ہے۔ لہذا وہ سر شام ہی گھر سے نکل گیا اور جب حمید ہی اُس کے پچک میں یہاں آیا تھا تو پھر قاسم کیوں نہ موجود ہوتا۔ وہ توروز ہی اسی لئے آتا تھا کہ شاکد سارہ سے ملاقات ہو جائے۔ جب سے اُسے پروفیسر غوری کی تجربہ گاہ میں فریدی اور حمید نظر آئے تھے اس نے دہاں جانا چھوڑ دیا تھا ورنہ اکثر شامیں جمیریاں ہی میں گذر کرتی تھیں۔

”آداب بجالا تا ہوں صدر صاحب۔“ حمید اُس کی میز کے قریب رک کر بولا۔ ”میں نہیں بجوانتا۔۔۔ دچا ہو جاؤ۔“ قاسم نے بیزاری سے ہونٹ سکوڑ کر دوسری طرف منہ پچھر لیا۔

حمدید نے خنگی کی وجہ پوچھی تو چک کر بولا۔ ”سالے تم میری جندگی بر باد قردو نے۔ ابے اُس دن تم ہی اُسے جلوش گاہ میں لائے تھے۔ قیوں لائے تھے۔ اب وہ سالی کہتی ہے میں بھی ترقی

خطوط لاتا رہتا تھا۔ جن میں زیادہ تر تکمیل ہدایت ہوتی تھی کہ وہ اپنا کام انتہائی خاموشی اور رازداری کے ساتھ جاری رکھے۔ اُس نے وہ سارے خطوط میرے حوالے کر دیے ہیں۔ ”اب پروفیسر کا کیا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے کہ اب وہ اس کی مکمل فوجی ادارہ تحقیقات کے تحت کرے گا۔ اُس کا بیان ہے کہ ابھی اس میں کچھ خامیاں ہیں جنہیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔“

”مگر اس کم بخت فچ نے اس کا دوسرا ہی مصرف پیدا کر لیا تھا۔“ حمید نے کہا۔

”میرا دامت میں تو اگر اُسے تین چار دن کی مہلت اور ملی تو وہ سارے شہر کا صفائی کر دیتا۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ یقین کرو۔ میں اُس دن اتنازج ہوا تھا کہ بس اسی کی کسر رہ گئی تھی کہ ایک بڑا سا پتھر اٹھاوں اور اپنے ہی سر پر مار لوں۔ یہ نخاسا کیڑا مجھے سارے جنگل میں نچائے پھر رہا تھا۔“

”مگر خدا کی قسم آپ کو سوچھی بھی خوب تھی۔ مجھے تو وہ تاریک سوادی میں سنگ ہی کی اُس وقت کی بے بُی یاد آئی تھی جب آپ نے اپنے کوٹ میں آگ لگا کر اسے گیس لگانے والے غار کی طرف پھینکا تھا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ سکار سکار ہاتھا۔ پھر حمید نے پوچھا کہ آخر فچ پروفیسر کو دہاں سے لے کیے گیا ہو گا۔

”ریو اور کی نال پر...!“ فریدی نے جواب دیا۔ ”اُسے تہہ خانے سے نکال کر گیراج میں لایا تھا اور اُسی سے کار بھی ڈرائیور کرائی تھی۔ ڈیہور کی پہاڑیوں میں لے گیا اور ایک غار میں بیٹھا اس سے مینگٹ بلٹ کے متعلق کامل معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جالیا۔ میں دو اصل والٹن کی تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک غار کے قریب سے گذرتے وقت میں نے فائز کی آواز سنی۔ یہ حماقت فچ ہی سے ہوئی تھی۔ اُس نے پروفیسر کو دھکاتے دھکاتے ایک فائز بھی کر دیا تھا لیکن شاکد اُس فائز کا مقصد بھی محض دھکانا ہی تھا۔ کیونکہ پروفیسر محفوظ رہا تھا۔ میں نے اُسے غار ہی میں پکڑ لیا ہوتا تھا لیکن وہ ڈاچ دے کر نکل گیا۔ اس طرح پروفیسر بھی اتفاقاً ہی تھا لگ

ہے کہ آپ کو لکھیجے میں بھرلوں۔ بگر میں برا بد نصیب ہوں۔ آپ اتنی بڑی ہیں کیسے
لکھیجے میں بھرلوں۔ یہ ظالم زمانہ ہمیں ملے نہیں دے گا۔ میں خود کشی کرلوں گا۔ اللہ
قسم دیکھ لیجئے گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں مل کر خاتمن کو خوب ترقی کراؤں!
جی ہاں آپ سمجھ گئیں! بنے بدنصیب کا پھاٹا... قاسم

حید نے بڑی سچیدگی سے خط غثتم کیا اور نہ اسامنہ بنا کر بولا۔ ”ابے ہے میں نے جو اتنے دنوں
میں محنت کی تھی سب پر سوڑا داڑ پھیر دیا تم نے.... خدا تمہیں غارت کرے۔“
”اب بتاؤ! میں قیارہوں۔“ قاسم روپا نئی آواز میں بولا۔ ”ول کی حالت لکھ دی تھی... پہ
نہیں کیوں کھفا ہو گئیں۔“

”اول تو تم نے اسے خط لکھا ہی کیوں؟ اگر لکھنا ہی تھا تو ان میں سے نقل کر دیتے جو میں بنے
لکھوائے تھے۔“

”تب اور بھی یہڑہ غرق ہو جاتا۔“ قاسم آنکھیں نکال کر غرایا۔ ”تم منہوس ہو۔ چلے جاؤ
یہاں سے کس نے کہا تھا کہ میری میز پر بیٹھ کر میری ہی دنیا اجالی... نن.... نہیں اندر ہیری
کر دو۔ جاؤ یہاں سے ہٹو درستہ وہ تو مجھے برابر خط لکھتی رہیں۔ میں لکھ دوں تو کھفا ہو جائیں.... قیا
بات ہوئی۔“

”برابر خط لکھتی رہتی ہے۔“ حید نے حیرت سے کہا۔
”قیامت نے نہیں دیکھے۔“ قاسم آنکھیں نکال کر نہیں بلکہ نقال کر ہی بولا۔ کیوں کہ اسے
بہت زور سے غصہ آگیا تھا۔

حید نے ٹھنڈی سانس لی اور مسکرا کر بولا۔ ”مگر ان خطوط پر تو کسی کا نام ہی نہیں ہوتا تھا پیارے۔“
”ہونہ ہو... میرا دل جو تھا ہے... اسے تم دن ٹینا خوشی ہی کرلوں گا۔“
”خود کشی۔“

”ٹھنگی سے... کچھ بھی ہو۔ کر لینے سے مطلب۔ خود کشی ہو یا تمہارے باپ کی دم وہ ہاپتا
ہو اٹھا اور لڑکھڑا تاہو اور روازے کی طرف بڑھ گیا۔“

ختم شد

کروں گی.... کر کر کھیلوں گی فٹ بال کھیلوں گی.... ٹھینگا پہنؤں گی۔ پتوں چباوں گی....
ہاں نہیں تو...؟“
”ارے تو وہ کیوں نہ کرے ترقی۔“

”اچھا...!“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔ ”تھماری باپ ہے سان لے! تم کون ہوئے ہو
تر پھدراری کرنے... کرنے... ہی ہی... آئیں... آئیں... ابے بیٹھ جاؤ حید
بھائی... لا اقسام شر پھوٹوں کی طرح۔“
وہ صدر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حید۔ بھی مڑا... شاہزادی تیزی سے چلتی ہوئی اسی
طرف آ رہی تھی۔

وہ میز کے قریب ہی آکر رکی لیکن تیور کہہ رہے تھے جیسے قاسم کو کچا ہی چجا جائے گی۔ قاسم
نے اس کی طرف دیکھا اور بوکھلا کر نظریں جھکالیں۔

”قاسم صاحب۔“ وہ اپنا اوپر ہونٹ بھینچ کر بولی۔ ”آپ گھاس تو نہیں کھائے۔“
”نج... جی نہیں... لا اقسام... قسم لے لیجئے۔“
”آپ بھینیتے ہیں۔ کان کھول کر سنئے۔ مجھے صرف ناڑک اندام مرد پسند آتے ہیں۔ جن کی

کر چلنے میں ہزاروں مل کھاتی ہو۔ صراحی دار گردن ہو اور باٹی دار کھوپڑی۔ سمجھے۔ اگر آئندہ
آپ نے مجھے اس قسم کا خط لکھا تو کسی چورا ہے پر ہی مرمت کروں گی۔ ذرا آپ بھی ملاحظہ
فرمائیے گا۔“

اُس نے حید کی طرف ایک لفاف پھیکا اور تیزی سے دروازے کی جانب مڑ گئی۔ قاسم کری
کی پشت سے ٹکا اور بھاڑ سامنہ کھولے کسی تھکے ہوئے گدھے کی طرح ہاپنے رہا تھا۔
حید نے لفافے سے خط نکالا... تحریر تھی۔
”بللِ محبت سلام قول ہووے۔“

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں یا کیا نہ لکھوں۔ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی
خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ کہ رات بھر جا گئی رہتا ہوں
دل میں نہ جانے کیا ہوتا ہے کبھی درد ہوتا ہے اور کبھی... بھر بھر بھر ہونے لگتا
ہے۔ اللہ کرے میں مر جاؤں۔ جب آپ مجھ کو سر پرست کہتی ہیں تو میرا بھی چاہتا۔